وَاللّٰہُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰی مَا تَصِفُوْنَ

سلسلۂ حالاتِ نظربندانِ اسلام

نمبر ۲

جس میں

مجاہدِ دستور مولانا سید فضل الحسن صاحب حسرت موہانی بی اے علیگ کی

سوانح عمری و مکمل حالاتِ اسیری درج ہیں

جسکو

صدر دفتر انجمن اعانت نظربندانِ اسلام دہلی نے

سنہ ۱۳۳۷ ہجری نبوی علیہ التحیۃ والتسلیم

جی اینڈ سنز پریس دہلی میں چھپوا کر شائع کیا

CENTRAL BUREAU FOR THE HELA OF THE MUSLIM INTERNEES, DELHI.

مدر دفتر انجمن اعانت نظر بندان اسلام

دھلی

مولانا فضل الحسن حسرت موھانی بی ۔ اے (علیگ)

کون ہے جو آج اپنے خدا کو قرض دے؟

نظر بندانِ اسلام کی مالی اعانت

کے لیے ایک سرمایہ قائم کیا گیا ہے۔ فدائیانِ اسلام اور محبانِ ملت اس کام میں ہمارا ہاتھ بٹائیں۔ اگر ہر شخص ارادہ کرلے کہ وہ ہر روز صرف ایک پیسہ اپنے نظر بندوں کے لیے دیا کرے گا۔ تو روزانہ کروڑہا پیسے جمع ہو سکتے ہیں!
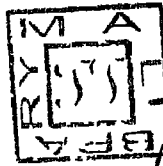
آپ جو کچھ جمع کرسکیں

انجمن کے خزانچی ڈاکٹر عبدالرحمٰن دہلی کے پتہ پر بھیج دیجیے

کہ یہ کام نہ ہمارا ہے نہ آپکا، نہ نظر بندوں کا، بلکہ خدا کا کام ہے!

الملتمس

(ڈاکٹر) مختار احمد انصاری ڈاکٹر عبدالرحمٰن

سکریٹریان۔ انجمن اعانت نظر بندان اسلام (دہلی)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مولانا فضل الحسن حسرت موہانی بی اے

ابتدائی اور طالب علمی کے حالات

آپ اور آپکے اجداد سادات کرام میں سے ہیں۔ اصلی وطن نیشاپور تھا۔ ترک وطن کرکے مضافات لکھنؤ کو شرف اقامت بخشا۔ اس جگہ قصبہ موہان ضلع اناؤ میں ۱۲۹۵ھ میں مولانا حسرت کی ولادت واقع ہوئی اس حساب سے اسوقت آپ کی عمر ۴۹ سال کی ہے۔ ابتداءً حسب دستور قرآن مجید اور فارسی کی تحصیل مولوی غلام علی موہانی اور موہان کے مشہور میانجی بلاقی سے گھر ہی پر کی۔ اسکے بعد اردو مڈل کے امتحان میں کامیابی حاصل کی اور تمام صوبہ میں ممتاز رہنے کے سبب سے وظیفہ حاصل کیا۔ اردو مڈل سے کامیابی کے ساتھ فراغت کرکے فتحپور ہسوہ چلے گئے۔ وہاں گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخل ہوکر انٹرنس کا امتحان خاص امتیاز کے ساتھ پاس کیا اور وظیفہ حاصل کیا۔

انگریزی تعلیم کے ساتھ ہی فارسی و عربی کی کتابیں بھی مولانا سید ظہور الاسلام صاحب بانی مدرسہ اسلامیہ فتحپور اور مولوی حبیب الدین صاحب مرحوم مدرس مدرسہ اسلامیہ فتحپور سے پڑھیں۔ اسکے بعد عربی کی بقیہ کتابوں کی تحصیل مولانا خلیل احمد صاحب اسرائیلی سے کی۔ غرضکہ اسی طرح انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ محض اپنے شوق سے پرائیویٹ طور پر عربی فارسی کی تعلیم کو بھی مکمل کرلیا۔

فتحپور میں مولانا کا زمانہ طالب علمی کے اعتبارات سے یادگار رہے گا۔ اول تو مولانا نور محمد۔ مولانا سید ظہور الاسلام صاحب اور مولانا حبیب الدین صاحب جیسے برگزیدگان و مقدس حضرات کا فیض صحبت ایک ایسی نعمت عظمیٰ تھی کہ پھر شاید ہی حسرت کو ایسی مقدس صحبت نصیب ہوئی ہو۔ اسکے علاوہ ان کے مخصوص احباب کی صحبت بھی نہایت پاکیزہ ...

لطیف تھی اس بزم رنگین کے بعض افراد ایسے تھے جنکی لطیف ہستیاں مولانا حسرت کے
جذبات شعری کے لئے محرک بن گئیں ان میں سے مولانا سید محمد ہاشم صاحب کے نام میں حسرت
کے لئے بہت کشش و جاذبیت تھی۔

حسرت کی شاعری کی نشوونما اور اس کی پرورش بھی فتحپور ہی میں ہوئی ہے۔
حسرت فطرتاً شاعر پیدا ہوئے۔ اور خدا نے ان کا دل و دماغ اس فن لطیف کے لئے
کچھ اس قدر موزوں بنایا تھا کہ شروع ہی سے شاعری کے چشمے اُبل پڑے۔ یہ تو نہیں کہا
جا سکتا کہ فتحپور ہی کے مقام نے آپ کو شاعر بنا دیا مگر اس میں کلام نہیں کہ طالبعلمانہ مصروفیت
کے ساتھ فتحپور میں ایسے محرکات لطیف کا اجتماع ہو گیا کہ حسرت کی فطری صلاحیت شعری
کو اس سے تقویت پہنچی اور آپ دل بیار دست بکار کی پُر لطف زندگی بسر کر سکے چنانچہ
آپ کی ابتدائی شاعری کا بیشتر حصہ فتحپور اور اسکے مضافات سے متعلق ہے۔ آپ اس قدر
پرشور شاعرانہ طبیعت لے کر فتحپور آئے تھے کہ آپکے تمام حلقہ احباب میں اب تک اسکی پرلطف
یاد باقی ہے۔ آپنے فتحپور میں ایک کلب بھی قائم کیا تھا مگر اس کے اغراض و مقاصد متعارف
کلبوں کے اغراض و مقاصد سے کوئی نسبت نہ رکھتے تھے بلکہ وہ ایک رنگین صحبت تھی جس
میں حسرت کے مخصوص احباب شریک تھے۔ اور ان دلچسپ و لطیف مشاغل میں سب سے زیادہ
دلچسپ مشغلہ شعر و سخن تھا۔

مولانا حسرت کی فطری صلاحیت شعری کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے۔ کہ
انٹرنس پاس کرنے سے پہلے ہی نہایت عمدہ شعر کہنے لگے تھے۔ شاید بہت ہی کم شعراء
ہوں گے جنہوں نے اس قدر کم عمری میں ایسے پاکیزہ شعر نکالے ہوں ہم یہاں پر فتحپور
کی طالب علمی کے زمانہ کے چند اشعار نقل کرتے ہیں اس سے آپ مولانا حسرت کی شعری استعداد
و صلاحیت کا اندازہ کر سکتے ہیں ؎

بار بار آتا ہے یہ کس کا خیال — بیخودی بتلا مجھے کیا ہو گیا

ناامیدی کا بُرا ہو آخر　　اب نہیں دلمیں تمنا کوئی

چشمِ جاناں کے ہیں دنیا سے نرالے انداز　　جب نظر کرتی ہے اک لطف نیا ہوتا ہے

اِن اشعار میں جذبات کی پاکیزگی کے علاوہ روانی و سلاست بھی پائی جاتی ہے جو اوستادانہ پختگی کلام کی پیشین گوئی کر رہی ہے۔

بہرحال مولانا حسرتؔ کا ابتدائی دورِ طالب علمی اپنے اندر ایسے آثار و علائم رکھتا تھا کہ ان کے آئندہ ترقی کرنے کی آسانی کے ساتھ پیشینگوئی کی جا سکتی تھی۔ حسرتؔ کے احبابِ فتحپور کا بیان ہے کہ ان کے کیرکٹر کی خوبیاں فتحپور ہی میں اچھی طرح نمایاں ہو چکی تھیں اور اردو انگریزی کے ہر دو امتحانات میں انکی اعلیٰ اور ممتاز کامیابی خود اس امر کی شاہد ہے کہ وہ کس درجہ علمی زندگی کو محبوب و عزیز رکھتے تھے۔

فتحپور سے انٹرنس کا امتحان پاس کرنے اور وظیفہ حاصل کرنے کے بعد علی گڈھ چلے آئے اور کالج میں داخل ہو گئے۔ یہاں بھی آپ ممتاز طالب علموں میں شمار کئے جاتے تھے اور کالج کی مشہور سوسائٹی یونین کلب میں اکثر آپ نے اردو انگریزی میں تقریریں کیں اور بعض مواقع پر قصائد اور نظمیں پڑھ کر سنائیں۔ جن کی نواب محسن الملک نے بارہا داد دی۔

آپ نے کالج میں ایک نئی انجمن قائم کی جس کے اغراض و مقاصد شاید اردو لٹریچر اور اردو نظم و نثر کو ترقی دینا اور صحیح مذاق شعری کی ترویج و اشاعت تھی۔ آپ کو علم ادب سے ہمیشہ سے ذوق خاطر رہا۔ یہی وجہ ہے کہ زمانہ طالب علمی ہی سے آپ کی توجہ اس طرف مبذول ہو گئی تھی جو بالآخر کالج سے نکلنے کے بعد اردوئے معلیٰ جیسے وقیع رسالہ کے اجرا کی صورت میں نکلا۔

دورِ ثانی اور قومی خدمات

آپ نے ۱۹۰۳ء میں کالج کی تعلیم سے فراغت حاصل کی اور بی۔اے کی ڈگری لیکر

بجائے کسی دفتر میں کلرکی کرنے کے قومی خدمت گذاری کو اپنا واحد نصب العین بنایا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے آپ نے اردوئے معلیٰ نکالا جو ادب و سیاست کے لئے اپنے وقت میں اپنا نظیر نہیں رکھتا تھا۔ یہ رسالہ ملک کے نامور رسالوں میں شمار ہوتا تھا اور بعض اوقات ملک کے مشہور اور قابل لوگوں کے مضامین بھی مشکل سے اسمیں جگہ حاصل کرسکتے تھے۔ اس رسالہ نے چار پانچ برس تک نہایت وقیع اور اہم سیاسی و ادبی خدمات انجام دیں اور آج جو غفلت شکن اور بیدارکن سیاسی روح مسلمانوں میں پائی جاتی ہے اوسکا پہلا واعظ حسرت موہانی اور اوسکا رسالہ اردوئے معلی تھا۔

مولانا حسرت کا ادبی و سیاسی مذاق ابتدا ہی سے نہایت صحیح اور سلیم واقع ہوا تھا چنانچہ شاعری میں وہ خاندان مومن کے متبع اور تسلیم تلمیذ نسیم دہلوی کے شاگرد ہیں اور اس مذاق کی اردوئے معلی کے ذریعہ آپنے اشاعت کی۔ خاندان مومن کے اتباع سے مولانا حسرت کی شعری سلیم المذاقی کا اچھی طرح سے اندازہ ہوسکتا ہے اسی طرح پالٹیکس میں آپ مشہور وطن پرست فدائے ملک و قوم مسٹر بال گنگادھر تلک اور بابو اربندو گھوش کے مقلد و متبع ہیں چنانچہ مسٹر تلک کے متعلق اپنی عقیدت کا ایک غزل میں اس طرح اظہار فرمایا۔

اے تلک اے افتخار جذبہ حب وطن — حق شناس و حق پسند و حق یقین و حق سخن
تجھسے قائم ہے بنا آزادیٔ بیباک کی — تجھسے روشن اہل اخلاص و صفا کی انجمن
سب سے پہلے تو نے کی برداشت ای فرزند ہند — خدمت ہندوستان میں کلفت قید محن
ذات تیری رہنمائے راہ آزادی ہوئی — تھے گرفتار غلامی ورنہ یاران وطن
تو نے خودداری کا پہونچا دی تلک ایسا فسوں — یک قلم جس سے خوشامد کی مٹی رسم کہن
ناز تیری پیروی پر حسرت آزاد کو — اسے تجھے قائم رکھے تا دیر رب ذوالمنن

اس لحاظ سے حسرت کے ہردو مذاق ادبی و سیاسی نہایت صحیح واقع ہوئے ہیں۔

اور اسی کے مطابق وہ اردوئے معلیٰ کو ترتیب دے کر ملک و قوم کے سامنے پیش کرتے تھے۔ بہر حال اردوئے معلیٰ پہلا اسلامی رسالہ تھا جس نے ملک میں صحیح سیاسی روح پھونکی اور چہل سالہ ہندوؤں کی مخالفت اور حکومت کی بیجا خوشامد و تملق کی پالیسی کے خلاف جہاد شروع کیا مگر یہ وہ زمانہ تھا جبکہ قدامت پسندی و استبداد پرستی کا دیو تمام اسلامی ہند پر مسلط تھا۔ اور کانگریس کی ہم سفیری اور اسکی موافقت میں آواز بلند کرنا کفر سے کم نہ سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ اسلامی سیاسی حلقہ میں اردوئے معلیٰ کو کبھی بار نہیں ملا اور نہ مولانا حسرت کی آواز اوسکو کچھ زیادہ متاثر کر سکی بلکہ بسا اوقات سخت و شدید مخالفت کی گئی۔ اردوئے معلیٰ کو گمراہ کن اور مولانا حسرت کو دیوانہ ملّا کا خطاب دیا گیا۔ اس مخالفت میں وہ لوگ بھی شریک تھے جو آج حریت و آزادی کے سالار قافلہ کہلاتے ہیں اور فی الواقع اب وہ اس معزز خطاب کے مستحق بھی ہیں۔ مثلاً مسٹر شوکت علی حسرت کو دیوانہ ملّا کہا کرتے تھے اور مولانا ابو الکلام اون کے ایک ہمخیال دوست سید حیدر رضا صاحب دہلوی کو سودیشی قلی کے خطاب سے یاد کیا کرتے تھے لیکن یہ حسرت کا اعجاز صداقت ہے کہ آج وہی لوگ حسرت کے بہترین ہمخیال اور ان کے سچے اور پاکباز دوست ہیں اور جس مشن کی تبلیغ حسرت کر رہے تھے اوس کے مکمل کرنے میں یہ حضرات سب سے زیادہ ساعی ہیں۔

حسرت کی سیاسی مشغولی

بقول بیگم صاحبہ حسرت موہانی زمانہ طالب علمی ہی سے مولانا حسرت کو سیاسی تحریک کے ساتھ خاص دلچسپی اور ہمدردی تھی۔ چنانچہ بی۔اے کی ڈگری حاصل کرنے کے دوسرے ہی سال یعنی ۱۹۰۴ء میں وہ بمبئی کانگریس میں بحیثیت ڈیلیگیٹ شریک ہوئے اور سورت کانگریس تک برابر شریک ہوتے رہے اور بمبئی کلکتہ۔ بنارس کانگریس کی اردو رپورٹیں بھی کتابی صورت میں بطور ضمیمہ اردوئے معلیٰ میں شائع کیں لیکن سورت

کے معرکۃ الآرا اجلاس کانگریس سے مسٹر تلک کے ساتھ ہی حسرت بھی علیحدہ ہو گئے۔ اور اسی طرح کانگریس سے نفرت کرنے لگے جس طرح آغاخانی لیگ سے اپنے سیاسی عقائد کی بنا پر کرتے تھے۔ لیکن لکھنؤ کے اجلاس مسلم لیگ کے بعد سے حسرت لیگ میں بھی شریک ہونے لگے کیونکہ لکھنؤ کے اجلاس میں مسلم لیگ کے نصب العین میں جمہور امت کے سیاسی عقائد کے مطابق اصلاح ہو گئی تھی۔ اور آیندہ اصلاح کی توقع قائم ہو چلی تھی۔ چنانچہ اس وقت سے آپ لیگ کے تمام اجلاسوں میں برابر شریک ہوتے رہے اور حق و صداقت کی ترجمانی میں کبھی آپ نے غفلت و کوتاہی نہیں کی حالانکہ ایسے مواقع آئے جن میں بڑے بڑے مدعیان حریت کے پاؤں صراط مستقیم سے ڈگمگا گئے مگر حسرت کے پائے عزم و ثبات کو کبھی لغزش نہیں ہوئی۔ چنانچہ مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ آگرہ میں جب آغاخاں نے مسجد مقدس کانپور کے فیصلے کے متعلق لارڈ ہارڈنگ کے شکریہ کا رزولیوشن پیش کیا تو مستبدین کے علاوہ اکثر احرار نے اسکی تائید کی لیکن مولانا حسرت اور مولوی عبدالودود بریلوی نے نہایت پر زور طریقہ سے اس سے اختلاف کیا اور آخر وقت تک اس رائے پر قائم رہے کہ موجودہ صورت حال جمہور مسلمانوں کی اس قابل نہیں کہ اسپر شکر و امتنان کا ریزولیوشن پاس کیا جائے۔

اسی طرح بمبئی کے اجلاس مسلم لیگ میں بھی آپ باوجود لوگوں کی در اندازیوں کے اظہار حق و اعلان صداقت سے باز نہیں رہے۔ حتیٰ کہ بعد میں مستبدین کیطرف سے اجلاس مسلم لیگ کو درہم برہم اور منتشر کر دینے کی جو کوشش کی گئی چونکہ یہ کوشش آپکے اختلافی رزولیوشن کے ساتھ ہی شروع کر دی گئی تھی۔ اسلئے اکثر حلقوں میں اس افساد و تفسید کا الزام مولانا حسرت ہی پر عائد کر دیا گیا۔

غرضکہ حسرت کی پرخلوص زندگی جرأت و صداقت کے محیر العقول کارناموں سے [illegible] ہے وہ شدید ترین موانع و مشکلات کے مواقع پر بھی اظہار حق سے کبھی باز

نہیں رہے ان کی پالیسی بالکل صاف اور غیر پیچیدہ ہے اور جس سختی کے ساتھ وہ اپنے سیاسی معتقدات کی حفاظت کرتے ہیں اور سخت و شدید مصائب و آلام اور خوفناک خطرات کے مقابلہ میں جس بے پروائی کے ساتھ وہ اب تک اپنی پالیسی پر قائم ہیں اسکی نظیر پولٹیکل رہنماؤں میں بہت کم مل سکتی ہے۔

دورِ ابتلا و آزمائش کا آغاز

خداوند قدوس کی یہ ایک سنت جاریہ ہے کہ وہ اپنے عزیز و محبوب بندوں کو ابتلاء و آزمائش میں ڈالتا اور اسکے ذریعہ مراتب و درجات میں بلندی عطا فرماتا ہے اور اگر اس امتحان و آزمائش میں وہ پورا اترتا ہے تو پھر وہ قادر قیوم اس بندہ پر کامیابی کی راہیں کھول دیتا ہے اور اسکی بے سروسامانی و تنہائی کے اندر اس قدر سامان فتح و قوت پیدا کر دیتا ہے کہ پھر کوئی طاقت اوسکا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

مولانا حسرت کے لئے بھی ان مراحل سے گزرنا اور ابتلاء و آزمائش کی اس کسوٹی پر کسا جانا ضروری تھا۔ خدا تعالےٰ کو ان کے خلوص و صداقت کا امتحان لینا منظور تھا اور اسکے ذریعہ ان کی برداشت مصائب کی قوت کو اس قدر ترقی عطا فرمانا منظور تھا کہ آئندہ باطل کی کوئی سخت سے سخت قوت بھی ان کے پُر خلوص کاروبار میں حارج نہ ہو سکے۔ چنانچہ عملاً میدان عشق میں قدم رکھے ہوئے چار ہی سال گذرے تھے کہ امتحان کی پرخطر وادیاں راستہ میں آنا شروع ہو گئیں وہ سخت گیریاں جو پردۂ خفا میں مستور رہ کر وقتاً فوقتاً دامنگیر ہوتی رہیں ان کے علاوہ ۱۹۰۸ء میں لطف ستم اور لذت ایذا کی کھلی ہوئی دعوت آپ کو دی گئی یعنی آپ پر اردوئے معلی میں ایک مضمون (مصر میں انگریزوں کی پالیسی) شائع کرنے کے جرم میں بغاوت کا مقدمہ دائر کر دیا گیا۔ اور جیسا کہ اس قسم کے مقدمات کا حشر ہوا کرتا ہے اسکے مطابق اسکا فیصلہ بھی کیا گیا یعنی آپ کو دو برس کی قید سخت کی سزا دیگئی۔

یہ مضمون جس کی وجہ سے آپ کو قید فرنگ کی سختیاں برداشت کرنی پڑیں حقیقت میں علی گڑھ کالج کے ایک طالب علم کا لکھا ہوا تھا۔ مگر حسرت کے اعلیٰ کیرکٹر اور ان کے اعلیٰ اخلاق اور خوبیوں کا اندازہ صرف اس ایک بات سے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے مضمون نگار کا نام نہیں لیا اور خود اسکی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔

حسرت کی بلند حوصلگی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ جن لوگوں نے ان کے خلاف شہادت دی تھی ان کو ان لوگوں سے کبھی کسی قسم کی پرخاش نہیں ہوئی اسکے مقابلہ میں نواب وقارالملک کے علاوہ اب تک علی گڑھ کے جاہ پسند اصحاب حسرت سے بلا وجہ بغض و عناد رکھتے ہیں اور عملاً مضرت رسانی کی فکر میں رہتے ہیں۔ لیکن حسرت نے آج تک ان حالات و واقعات کو کبھی پبلک طور پر ظاہر نہیں کیا۔

بہرحال اس مقدمہ میں آپ کو سزا ہوگئی اور مصائب و آلام کا ایک ایسا دور شروع ہوا جس نے حسرت کی روحانی و ایمانی قوتوں میں بے شمار اضافہ کر دیا۔ یہ مصائب و آلام معمولی نہ تھے۔ حسرت کے ساتھ جیل میں جو سختیاں کی گئیں وہ ظلم و بے انصافی کی عبرتناک مثالیں ہیں اور جب محکوم ہندوستان کی تاریخ لکھی جائے گی تو حسرت پر جس قدر ظلم توڑے گئے ہیں اور ان پر جس قدر جور و ستم کی بارش کی گئی ہے وہ اس تاریخ کا سب سے زیادہ تاریک اور سیاہ باب ہوگا۔

سب سے پہلی اور سب سے زیادہ سخت ناانصافی جو حسرت کے ساتھ کی گئی وہ یہ تھی کہ اُن میں اور اخلاقی مجرموں میں کوئی فرق نہیں کیا گیا۔ اور نہ صرف یہ بلکہ تمام مجرمین سے بھی زیادہ ذلت انگیز اور تکلیف دہ برتاؤ ان کے ساتھ کیا گیا یہاں تک کہ قواعد جیل کے مطابق جن رعایتوں سے عام قیدی مستفید ہوتے رہتے ہیں حسرت کو ان سے بھی ہمیشہ محروم رکھا گیا۔ مثلاً یہ کہ کسی قیدی سے چکی پیسنے کی سخت ترین مشقت دس پندرہ روز سے زیادہ نہیں لی جاتی مگر حسرت کی تمام میعاد قید اسی

مشقت میں گذری اور جب تک جیل میں رہے چکی ہی پیستے رہے۔ یہاں تک کہ پورا رمضان المبارک اس صبر آزما شغل میں بسر ہوا۔ پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اسکے علاوہ حکام جیل کی طرف سے دوسری قسم کی سخت گیریاں بھی عمل میں آتی رہیں مثلاً کسی کو اجازت نہ تھی کہ وہ حسرت سے گفتگو کرے یا ملازمان جیل میں سے کوئی شخص مولانا کے ساتھ جائز رعایت بھی نہیں کر سکتا تھا۔

خود مولانا حسرت نے اپنے رسالہ اردوئے معلی میں آغاز قید کا حال اس طرح لکھا ہے:۔ ۴۔ اگست ۱۹۰۸ء سے قید سخت کا آغاز اس طرح ہوا کہ کچہری سے جیل واپس پہونچتے ہی ایک لنگوٹ ایک جانگیا اور ایک کرتہ ٹوپی پہننے کو اور ایک ٹکڑا ٹاٹ کا اور کمبل اوڑھنے بچھانے کے واسطے اور ایک قدح آہنی بڑا اور ایک چھوٹا دیگر جملہ ضروریات کو رفع کرنے کی غرض سے مرحمت ہوا۔ ان چند چیزوں کے سوا قیدی کو اور کوئی شے پاس رکھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ابتدا میں سامان بود و ماند گی اس تقلیل سے کسی قدر تکلیف ضرور محسوس ہوئی لیکن بہت جلد طبیعت نے انہی کے استعمال پر قانع ہو کر ایک عجیب و غریب سبق حاصل کیا کہ اگر انسان ہوا و ہوس کو ترک کر دے تو زندگی کی ضرورتیں اس قدر کم ہیں اور وہ اتنی آسانی کے ساتھ فراہم ہو سکتی ہیں کہ بظاہر ان کے لئے انسان کو جبر و ستم یا مکر و فریب کے وسائل اختیار کرنے اور بعض اوقات اغیار کی بندگی و غلامی تک کے قبول کرنے پر آمادہ ہو جانا ایک حیرت انگیز معاملہ نظر آتا ہے۔

زندانی معاشرت کی یہ فقیرانہ شان ہر طرح سے راقم حروف کے مناسب حال تھی البتہ ابتدا میں بحالت نیم برہنگی فریضہ نماز کے ادا کرنے میں تکلف ہوتا تھا لیکن رفتہ رفتہ اپنی مجبوری و بے بسی کے احساس نے اسکا بھی خوگر بنا دیا جیل کی سخت ترین "مشقت" چکی سے پہلے ہی روز سابقہ پڑا اور راقم نے بمصداق "بر سر اولاد آدم ہر چہ آید بگذرد"

اس جبری خدمت کو بسر و چشم قبول کیا۔

اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ لوگوں کا عام طور پر خیال تھا کہ یہ مشقت چند روزہ ثابت ہوگی اور کسی سنٹرل جیل میں تبدیل ہونے پر کوئی لکھنے پڑھنے کا کام مل جائے گا۔ چنانچہ وفعتہً ۱۴۔ اگست کو تبادلہ کی خبر معلوم ہوئی تو لوگوں کے اس گمان کو اس بنا پر تقویت حاصل ہوئی کہ اس جیل میں گورنمنٹ برانچ پریس اور جیل پریس کی موجودگی میں کوئی لکھنے پڑھنے کا کام لیا جائے گا۔ لیکن راقم کو اہل فرنگ کی شرافت اور عالی حوصلگی سے اس رعایت کی توقع نہ تھی۔ چنانچہ بعد میں میرا خیال صحیح نکلا اور وہاں بھی چکی کی پر اذیت و ذلت انگیز مشقت سے سابقہ پڑا۔ اور تقریباً ساری مدت روزانہ ایک من آٹا پیسنے سے سروکار رہا۔ حالانکہ عام قیدیوں سے بھی عموماً چکی ایک یا دو ماہ سے زیادہ نہیں پسوائی جاتی"

علی گڈھ سے الہ آباد جیل کی روانگی اور وہاں پہنچنے پر جن تکالیف کا سامنا ہوا اسکی نسبت مشاہدات زندان فرنگ کے تحت میں مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ گورنمنٹ نے کرایہ کے علاوہ دوسری ضروریات کے لئے ایک پیسہ زائد نہیں دیا یہاں تک کہ راستہ میں قیدیوں کی خوراک کے لئے ار فی کس فی روز کے حساب سے ملتا ہے وہ بھی نہیں ملا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے دن صبح تک تھوڑے سے بھنے ہوئے چنوں کے سوا کچھ کھانے کو نہ ملا"

"الہ آباد جیل میں داخل ہونے کے بعد علی گڈھ جیل کے کپڑے اتروا لئے گئے اور کہا گیا یہاں کے کپڑے کچھ دیر میں ملیں گے۔ اسوقت تک کالے کپڑے پہنو جنکی کیفیت یہ تھی کہ اتنے زیادہ کثیف غلیظ اور بو دار کپڑوں کا تصور بآسانی ذہن میں نہیں آسکتا لیکن مجبوراً وہی کپڑے پہننے پڑے۔ عینک بھی اتروالی گئی۔ حالانکہ علی گڈھ میں معائنہ کے بعد اجازت مل گئی تھی اور چونکہ مولانا کی نگاہ دوربین نہیں ہے اسلئے بغیر عینک

کے وہ بالکل معطل سے ہو گئے) تھوڑی دیر کے بعد جیلر صاحب نازل ہوئے۔ اور میرے ساتھ کے تمام اخباروں کتابوں اور کاغذوں کو باستثنائے دیوان حافظ جلا کر خاکستر کر دیا اور دفتر میں حاضر ہونے کا حکم صادر فرمایا۔

دفتر میں مجکو غضب آلود اور قہر بار نگاہوں سے دیکھکر ارشاد ہوا کہ اگر یہاں ٹھیک طور سے نہ رہوگے تو بیمار بنا کر اسپتال بھیجے جاؤگے۔ اور وہاں مار کر خاک کر دئے جاؤگے۔"

اسکے علاوہ ان وفاداروں کو جو قیدیوں سے کام لیتے ہیں حکم ملا تھا کہ ان کے دماغ کی گرمی نکال دو۔ اسکا منشا یہ تھا کہ بلا وجہ مولانا کو اذیت پہونچائی جائے۔

بہرحال اس پرستار حریت و فدائے ملک و قوم نے ان مصائب و تکالیف کو ہنسی خوشی برداشت کر لیا اور کبھی ایک لمحہ کے لئے کمزوری کو اپنے پاس تک نہ آنے دیا بلکہ ستمگاریوں سے امر حق کی خدمت گذاری کا ولولہ اور زیادہ نشو و نما پذیر ہوا اور ایسی قوت حاصل کر لی کہ برسوں کی ریاضات و مجاہدات سے بھی یہ بات حاصل نہ ہوتی۔

یہ بھی خداوند ارض و سما کا ایک احسان عظیم تھا کہ اس نے مسکین حسرت کو پہلے تو مبتلائے آلام کیا پھر خود ہی اوس کی برداشت کی قوۃ عطا فرمائی۔ اسکے علاوہ دیگر اخلاق حسنہ اور صفات حمیدہ کی طرف بھی اس قید فرنگ کے ذریعہ رہنمائی کی چنانچہ عزم و استقلال کے علاوہ یہ سبق بھی مولانا کو حاصل ہوا کہ "آنچہ ما در کار داریم اکثر در کار نیست"، چنانچہ اب مولانا بالکل فقیرانہ اور درویشانہ زندگی بسر کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ سامان معاش کی تلاش میں دیوانہ وار اور حریصانہ طریق سے ارذل امور و ذمائم اخلاق کے جال میں نہیں پھنسے اور ہر وقت ان سے جدا ہو جانے کے لئے تیار ہیں یعنی انہوں نے اپنی ضروریات و متعلقات کو اس قدر مختصر و محدود کر لیا ہے کہ وہ آیندہ درد و مصائب سے گھبراتے نہیں اور ان سے جدا و علیحدہ ہو جانے کے خوف سے حق و صداقت

کے نشر و اعلان سے باز نہیں رہتے جیسا کہ ملک و قوم کو بارہا تجربہ ہو چکا ہے اور اب اس تجربہ کی تجدید ہو رہی ہے۔

مختصر یہ کہ اس پُر آلام و محن زمانہ قید کو مولانا نے صبر و شکر کے ساتھ حکیم شیراز کے اس شعر کو زبان حال سے پڑھتے ہوئے ختم کر دیا :۔

پنداشت ستمگر کہ جفا بر ما کرد　　بر گردن او بماند و بر ما بگذشت

برکات السجن

دیار صدق و اقلیم صداقت کا یہ ایک مسلم مسئلہ ہے کہ باطل کے جبر و تسلط میں بھی حق کی سربلندی کی قوت مخفی ہوتی ہے۔ اور ظلم و عدوان کی راہیں بھی آخر میں دیار حق کے صراط مستقیم سے جا ملتی ہیں یعنی انسان کی مادی طاقت اپنی قہرمانیوں کے اندر جادہ صداقت کے لئے ایک نور مستور رکھتی ہے اور وہی نور مستور بالآخر ظلمت استبداد کی چادر کو چاک کر کے سیہ خانۂ ظلم و طغیان کو منور کر دیتا ہے غرضکہ ابتلاء و آزمائش کا دور آخر ین حق و صداقت کے لئے بے شمار فوائد و برکات اور لا تعد و لا تحصیٰ منافع و مفاد کا واحد ذریعہ ہوا کرتا ہے۔ پھر اس کلیہ سے مولانا حسرت کی ذات گرامی کیونکر مستثنیٰ رہتی اور یہ کیونکر ممکن تھا کہ ایسے کاروبار کی نصرت بخشی کے لئے خداوند قدوس کا دست اعانت فرما حسرت کی طرف نہ بڑھتا۔ یقیناً اسکو جنبش ہوئی اور اسنے حسرت کو اپنی پناہ میں لے لیا۔ پھر اب وہ کونسی قوت ہے جو حسرت پر فتح پا سکے اور کونسی طاقت ہے جو حسرت کی قوت ایمانی کو زیر کر سکے یہی ایک فضل و تائید ربانی برکات السجن کے تحت میں کیا کم ہے کہ کسی دوسری چیز کی تلاش میں آپ نکلیں حالانکہ اسکے علاوہ قید فرنگ کی سختیوں نے حسرت کے دامن کو روحانی فیوض سے مالا مال کر دیا اسکو بھی نظر انداز کیجئے برکات السجن کے صرف اس حصہ کو لیجئے جس کا تعلق براہ راست ملک و قوم سے ہے۔

دنیا کی تاریخ حریت و استبداد کا بغور مطالعہ کیجئے آپ کو ایسے نفوس قدسی کی مثالیں بکثرت ملیں گی جو قید کی پرمحن زندگی میں بھی قومی خیال سے غافل نہیں رہے اور وہاں بھی سلسلہ رشد و ہدایت اور خدمت فرمائی کو انہوں نے جاری رکھا۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ حضرت امام احمد بن حنبلؒ حضرت علامہ ابن تیمیہؒ حضرت مجدد الف ثانیؒ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی ان کے علاوہ موجودہ عہد میں بلا قید مذہب و ملت مقتدائے وطن پرستان مسٹر بال گنگا دھر تلک حسرت کی طرح یہ تمام حضرات اپنے اپنے عہد میں حمایت حق و پرستاری صدق کے جرم بے جرمی میں مقدس بیڑیاں اپنے پیروں میں پہن چکے ہیں اور جیل کی صعوبات میں گرفتار ہو چکے ہیں مگر ان بلاکشان صداقت نے ان پر اذیت لمحات میں قوم کو فراموش نہیں کیا اور جس قدر ممکن ہو سکا خدمت کرتے رہے یعنی اگر زبان بند کر دی گئی تو قلم کو انہوں نے نہیں چھوڑا اور جس حد تک اسکو آزادی دی گئی انہوں نے اس سے کام لیا۔

بعض بزرگوں کے حالات تو اس قسم کے موجود ہیں کہ ان کے مقدس وجود نے جیلخانہ کو بھی خانقاہ دار الحدیث اور موعظت خانہ بنا دیا اور ہزاروں بداخلاق قوموں کو چند ہی روز میں متخلق باخلاق اللہ انسانوں کی صورت میں تبدیل کر دیا اکثروں نے تالیفات و تصنیفات کا شغل جاری رکھ کر موتیوں میں تولنے کی قابل پر از حکمت و موعظت مصنفات قوم کے لئے تیار کر دیں لیکن حسرت کے مقدس جسم کی طرح انکا قلم بھی مجبور و محبوس تھا۔ اور سخت تاکید تھی کہ کاغذ قلم دوات کیا کاغذ کا ردی ٹکڑا بھی ان تک نہ پہنچ جائے۔ لیکن با این ہمہ اوس نے رمضان المبارک میں روزے رکھ رکھ کر اور چکی پیس پیس کر ایک عدیم النظیر دیوان تیار کر دیا اور اس طرح اردو لٹریچر میں ایک قیمتی اضافہ ہوا اس دیوان کی شعری لطافت و پاکیزگی جو قیمت رکھتی ہے حق یہ ہے کہ وہ انمول ہے۔ لیکن اسکے علاوہ مولانا حسرت نے پردۂ شعر میں جابجا حریت

و وطن پرستی کا درس دیا ہے۔ اور حق کی طرف انھوں نے اس ذریعہ سے رہنمائی کی ہے
یہی وہ چیزیں ایسی ہیں کہ دوسروں کی آزادی سے زیادہ قیمتی ہیں مگر ان کے علاوہ بھی
مولانا نے ایک خدمت ملک و قوم کی کی ہے یعنی مشاہدات زندان فرنگ کے عنوان سے
موصوف نے ایک طویل سلسلہ میں جیل خانوں کی وہ بدانتظامیاں اور ابتریاں بیان
کی ہیں جن کو سُنکر انسانیت کی روح لرز جاتی ہے اور اس امر کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے
کہ اس عہد تہذیب میں دور ظلمت و وحشت کی یاد کو کس طرح زندہ رکھنے کی کوشش
کی جاتی ہے۔

تمام متمدن ممالک میں جیل خانوں کا انتظام نہایت عمدہ ہوتا ہے اور کوشش
کی جاتی ہے کہ مجرموں کے اخلاق درست ہو جائیں نیز کوئی وحشیانہ برتاؤ ان کے
ساتھ نہیں کیا جاتا۔ لیکن ہندوستان کی برٹش گورنمنٹ کے انتظامات جیل حسب تحریر
مولانا حسرت موہانی اس قدر ابتر و بدتر ہیں کہ اصلاح و درستی کے عوض مجرمین کے اخلاق
اور زیادہ ذلیل و مبتذل ہو جاتے ہیں اور خلاف انسانیت و تہذیب جو سختیاں روا
رکھی جاتی ہیں ان کا تو کچھ ذکر ہی نہیں ہے۔ مولانا حسرت نے انتظامات جیل پر نہایت
تفصیلی ناقدانہ نظر ڈال کر اہل ملک کو اس سے آگاہ کیا اور کونسل کے آنریبل
ممبروں کو توجہ دلائی چنانچہ آنریبل بابو گنگا پرشاد صاحب ورما آنجہانی نے صوبجات
متحدہ کی کونسل میں ایک سوال کے ذریعہ گورنمنٹ کو اس حالت زار کی طرف توجہ دلائی۔
اگرچہ حکومت نے نہایت متمردانہ اور مغرورانہ انداز میں اس سوال کو ٹھکرا دیا تاہم
اہل ملک اس حقیقت سے کم از کم آگاہ ہوگئے۔ حکومت کی بے نیازی و استغنا کو شکست
دیکر اپنے مطالبات کو تسلیم کرا لینا تنہا حسرت کا نہیں بلکہ تمام ملک و قوم کا کام
ہے۔

آنریبل موصوف آنجہانی نے دریافت کیا تھا کہ "آیا گورنمنٹ کی نظر سے

اردوئے معلی کے یہ مضامین گذرے ہیں اور آیا ان کی بابت کچھ تحقیقات کی جائے گی"
لیکن اس سوال کا جواب انسپکٹر جنرل صاحب نے کمال تمرد و بے پروائی سے یہ دیا
کہ "گورنمنٹ کے نزدیک ان مضامین کی کوئی وقعت نہیں ہے اور ان کے متعلق نہ کوئی
تحقیقات کی گئی ہے اور آیندہ کی جائے گی" یہ جواب جن پر غرور الفاظ اور جس
غضبناک لہجہ میں دیا گیا ہے اس سے اس امر کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ غریب حسرت
پر جیل میں کیا کچھ ستم نہ توڑے گئے ہونگے۔ اور یہ کہ حکومت کو مولانا حسرت سے
کس درجہ عناد ہے اس جواب کے متعلق مولانا حسرت اپنے رسالہ اردوئے معلی کے نوٹ
میں تحریر فرماتے ہیں کہ "خیر آپ حاکم ہیں ہم لوگ محکوم جو چاہے کیجئے لیکن اتنا خیال رہے
کہ جبر و خود سری کے ساتھ غرور اور تمرد زوال کی یقینی علامت ہے"

سیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔

ابتداءً حسرت کو مجسٹریٹ علیگڈھ نے دو سال قید سخت اور پانچسو روپیہ جرمانہ
کی سزا اپنے تمام اختیارات سے کام لے کر دی تھی۔ جرمانہ کے وصول کرنے میں اس
سزا کی نوعیت میں وہ اور اضافہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ عالی حوصلہ مجسٹریٹ نے زرجرمانہ
وصول کرنے کے حیلہ سے حسرت کا نہایت نادر و قیمتی کتب خانہ برباد کر ڈالا۔ یہ کتب خانہ
تقریباً چار ہزار روپیہ کا تھا اور اس میں نہایت نادر و نایاب قلمی کتابیں تھیں ایسا قیمتی
اور لاجواب کتب خانہ صرف ساٹھ روپیہ میں برباد کر دیا گیا ظاہر ہے کہ اس حرکت سے مولانا
حسرت کو جس قدر تکلیف ہوئی ہوگی اس کا اندازہ صرف اہل علم و ذوق ہی کر سکتے ہیں مولانا
نے اس زیادتی کے متعلق جو خیالات ظاہر فرمائے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

"اس جرمانہ کی بدولت کتب خانہ اردوئے معلی کی جو حالت ہوئی اس کا بیان
نہایت دردناک ہے۔ جن کتابوں کو راقم حروف نے معلوم نہیں کن کن کوششوں اور
دقتوں سے بہم پہونچایا تھا جن کتابوں میں بہت سے ایسے نایاب اور قلمی نسخے ذور کیا

شعراء وغیرہ کے تھے۔ جن کی نقل بھی کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتی ان سب کو پولیس کے جاہل جوان ٹھیلوں میں اس طرح بھر بھر لے گئے۔ جس طرح لوگ لکڑی اور بھس لیجاتے ہیں ان کتابوں کی فہرست بنانا تو درکنار کسی نے ان کو شمار تک نہ کیا اسکے بعد ان کتابوں پر کیا گذری۔ اسکا ذکر کرتے ہوئے ہمارا دل دکھتا ہے۔ اسلئے اس سے قطع نظر ہی مناسب ہے۔ اس جبر وظلم کا انصاف خدا کے ہاتھ ہے "

بہرحال مجسٹریٹ صاحب علی گڈھ کے اختیار میں جس قدر تھا انہوں نے حسرت کو اذیت دینے اور ان کو برباد کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا لیکن ان کی تجویز کردہ دو برس کی میعاد میں ہائی کورٹ سے ایک سال کی تخفیف ہو گئی۔ اور چونکہ حسرت کی مالی حالت نہایت سقیم تھی کیونکہ وہ ایک فقیرانہ زندگی بسر کر رہے تھے اس لیے زرجرمانہ کے عوض چھ ماہ قید سخت کی اس میں اضافہ ہو کر ڈیڑھ سال کی مدت قید رہ گئی اس قدر طویل مدت بھی حسرت پر سختیاں کرنے کے لئے کچھ کم نہ تھی۔ چنانچہ حکام جیل نے حسرت کو تکلیف پہونچانے اور ان پر غیر معمولی سختیاں کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی پورے دس مہینہ تک برابر روزانہ ایک من گیہوں مولانا کو پیسنے پڑے اور اگر مولانا پورے ڈیڑھ برس تک جیل میں رہتے تو باقی میعاد بھی اسی محنت میں کاٹنی پڑتی مگر مولانا کے والد بزرگوار کے انتقال کی وجہ سے حسرت کے بڑے بھائی سید روح الحسن صاحب وکیل حیدر آباد دکن نے زر جرمانہ مجبوراً ادا کر دیا کیونکہ اگر ایسا نہ کرتے تو وراثتہً جو قلیل جائداد حسرت کو ترکہ میں ملی تھی اسکو بھی مجسٹریٹ علیگڈھ نیلام کرا ڈالتے اور جس طرح کتب خانہ برباد کر دیا گیا تھا اسی طرح جائداد کو بھی مفت تباہ کرا ڈالتے اس طرح گویا چھ مہینہ کی مدت او گھٹ گئی۔ اور صرف ایک سال آپ جیل میں رہے اور اس تمام مدت میں آپکو چکی ہی کی سخت مشقت سے سابقہ رہا۔

یہ ہے وہ داستان درد جو ایک پرستار حق وحامی صداقت کو اہل استبداد

وارباب اقتدار کے ہاتھوں برداشت کرنی پڑی ۔

ابتلاء و آزمائش کے بعد

مولانا حسرت نے اس امتحان خداوندی میں ثابت قدم رہ کر یہ ثابت کر دیا کہ اہل ایمان دنیا کی کسی طاقت سے کبھی کسی حالت میں مرعوب نہیں ہو سکتے۔ اور ان کا سر نیاز سوائے خداوند قدوس کے آستانہ عز و جلال کے کسی دوسرے دروازہ پر کبھی نہیں جھک سکتا۔ ان کو مصائب و آلام کے طوفان اپنی جگہ سے ایک انچ ادھر ادھر نہیں کر سکتے ان کے ناتوان جسم اور ان کی کمزور ہستیاں پہاڑوں سے زیادہ وزنی ہوتی ہیں جنکو ضلالت و گمراہی کی تھپیڑیں جنبش تک نہیں دے سکتیں۔ چنانچہ مولانا حسرت نے یہ تمام مصائب و آلام برداشت کرکے اور پھر اپنے معتقدات پر اس سختی کے ساتھ قائم رہ کر ثابت کر دیا کہ حق کی قوت کبھی مغلوب نہیں ہو سکتی اور صداقت کی لازوال طاقت کسی کے فنا کرنے سے فنا اور کسی کے نیست و نابود اور برباد کرنے سے برباد نہیں ہو سکتی۔ بلکہ جس طرح گیند کو پٹک کر اور سیلاب کو روک کر اسکی قوت میں اور اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح حق کو دبانے سے اسکی طاقت اور بھی زیادہ زور و قوت حاصل کر لیتی ہے۔ مولانا حسرت کا حال اس حقیقت کے بالکل مطابق ثابت ہوا۔ وہ قید فرنگ سے آزاد ہونے اور مصائب و آلام برداشت کرنے کے بعد اور زیادہ جری و بیباک اور اپنے عزائم و افکار میں اور زیادہ راسخ و ثابت قدم ہو گئے۔

چنانچہ قید فرنگ سے آزادی حاصل ہونے کے بعد حسرت کے بعض کمزور طبیعت احباب نے لکھا کہ اب آپ اپنی روش بدل لیجئے تاکہ آئندہ مصائب سے محفوظ رہیں۔ مگر حسرت نے جو اشعار [illegible] احباب کے ان مشوروں کا جواب دیا ہے اس کو پڑھکر روح میں بالیدگی اور راحت پیدا ہوتی ہے۔

مولانا حسرت کی پالیسی

"اردوئے معلی کی دوبارہ اشاعت پر چند احباب نے بمقتضائے محبت و ہمدردی یہ صلاح دی ہے کہ ہم کو اب پالٹیکس سے بالکل دستکش ہو جانا چاہیئے۔ بعض کا منشاء یہ تھا کہ اگر سیاسی مضامین ہوں بھی تو مسلم لیگ کی مسلمہ پالیسی کے موافق ہوں چند دوستوں نے جو یقیناً زیادہ آزاد خیال ہیں۔ یہانتک اجازت دی کہ اگر جمہور اہل ہند ہی کا ہم خیال منظور ہو تو کانگریس کے زمرۂ فرینج کی روش اختیار کی جائے۔

"ہم پر ان تمام نیک نیت مشوروں اور مصلحت کوش صلاحوں کا شکریہ فرض ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے خیال میں یقین یا عقیدہ عام اس سے کہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی ایک ایسی چیز ہے جسکو کسی خوف یا مصلحت کے خیال سے ترک یا تبدیل کر دینا اخلاقی گناہوں میں سے ایک بدترین گناہ ہے جسکے ارتکاب کا کسی حریت پسند یا آزاد خیال اخبار نویس کے دل میں ارادہ بھی نہیں پیدا ہو سکتا۔"

"پالٹیکس میں ہم مقتدائے وطن پرستان مسٹر تلک اور سرگروہ احرار بابو اربندو گھوش کی پیروی کو اپنے اوپر لازم سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اس حیثیت سے فیروز شاہی کانگریس سے ہم کو اتنی ہی بیزاری ہے جتنی امیری مسلم لیگ یا نوزائیدہ لال چندی کانفرنس سے اور ہمارے خیال میں یہ بیزاری بالکل حق بجانب ہے اسلیئے کہ دنیا کی رفتار اور اہل دنیا کے طبائع کا میلان صریحاً حریت کی جانب ہے چنانچہ خواہ براعظم ایشیا میں بھی ہندوستان کے سوا اور کوئی بڑا ملک اسوقت آزادی کی نعمت سے محروم نہیں ہے۔ پس عقل سلیم کسی طرح باور نہیں کر سکتی کہ تمام عالم میں صرف ہندوستان ہی ایک ایسا ملک باقی رہے جسکی قسمت میں محکومی مدام کی ذلت لکھدی گئی ہو یہ ایسا گمان بظاہر مشیت ایزدی کے سراسر خلاف نظر آتا ہے۔

"غرضکہ ارباب دانش و بینش کو یہ بات ماننی پڑے گی کہ فرنگی حکومت کا غیر طبعی

نظام ہمیشہ کے لئے ہندوستان میں باقی نہیں رہ سکتا۔ اور اپنی موجودہ صورت میں تو اسکا چند سال قائم رہنا بھی دشوار نظر آتا ہے۔

گرم فریق کے رہنما عموماً اور بابو آربندر گھوش خصوصاً تمام پولیٹیکل کوششوں میں مذکورۂ بالا اصول کو پیش نظر رکھتے ہیں اسواسطے ہمارے نزدیک وہ حق پر ہیں۔

برخلاف اسکے رہنمایان فریق نرم پیروان مسلم لیگ اور بانیان ہندو کانفرنس اہل ہند اور دوامی محکومی کو لازم وملزوم سمجھتے ہیں کیونکہ ان حضرات کے نزدیک ہمارے انتہائی عروج کا مفہوم صرف اسقدر ہے کہ ہم غلام سے ترقی یافتہ غلام یا محکوم سے خوشحال محکوم ہو جائیں۔

یہ لوگ آزادی ہند کی خواہش کو خواب وخیال سے زیادہ وقعت نہیں دیتے ان کا دائرہ خیال اور اسلئے دائرہ عمل بھی نہایت تنگ اور محدود ہے انکی روش دنیا کی رفتار حریت کے خلاف اور اسلئے قطعی طور سے غیر طبعی اور نا قابل قبول ہے۔

ارروئے معطے کو ان لوگوں کی پالیسی سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ بقول مرحوم مصطفےٰ کامل پاشا مفتوح قوموں اور ملکوں کے لئے اسکے سوا اور کوئی پالیسی نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنی تمام محنت کے ساتھ حریت کامل کے دوبارہ حاصل کرنے کی سعی میں مصروف ہو جائیں۔

پس جس شخص کی پالیسی اس سے کچھ بھی مختلف ہو اسکی نسبت سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ بہی خواہان وطن کے گروہ سے یقیناً خارج ہے"

یہ ہے وہ پالیسی جسکا اظہار رشد اند قید برداشت کرنے اور اس سے آزادی حاصل کرنے کے بعد مولانا حسرت موہانی نے کیا۔ اس بیان سے مولانا کی بلند خیالی حوصلہ مندی اور بیباک جرأت وعلوئے ہمت کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ اپنے خیالات ومعتقدات کے مطابق جیل جانے سے قبل بھی ان کا عمل تھا اور وہاں سے آتے

بعد بھی ہمیشہ اسی پر عمل رہا اور اب تک اس پالیسی پر کار فرما ہیں۔

اس سے ان کے عزم و استقلال ثبات ارادہ اور استقامت فی الرائے پر کافی روشنی پڑتی ہے کہ مولانا حسرت کس کیرکٹر کے بزرگ ہیں اور انہوں نے قومی فلاح و بہبود کی خاطر اپنے تئیں کس قدر مہالک و خطرات میں ڈالا اور کس حد تک انہوں نے مصائب و نوائب کے علاوہ نقصانات برداشت کئے۔

یہ بالکل واقعہ ہے کہ مولانا حسرت اگر چاہتے تو دنیاوی ثروت و جاہ لور دولت و عزت کے حصول میں اپنے کسی معاصر سے پیچھے نہ رہ سکتے تھے خدا نے ان کو ہر طرح کی قابلیت عطا فرمائی تھی دل و دماغ اور زبان و قلم سب ہی کچھ ان کے پاس موجود تھا اسپر مستزاد یہ کہ ضروریات اسکی مقتضی تھیں۔ اس کے علاوہ ان کو معلوم تھا کہ آج کل ہر دولت مند کس قدر آسانی سے قوم کا لیڈر بن جاتا ہے۔ یہ سب امور ایسے تھے کہ ایک بندہ ہوا و ہوس کے لئے انکا اختیار کرنا امر ناگزیر تھا۔ لیکن اس قدر محرکات قویہ کے باوجود انہوں نے ان میں سے کسی ایک بات کی طرف بھی کبھی توجہ نہیں کی۔ نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ قومی خدمت گزاری کا ولولہ صرف یہی ایک دولت تھی۔ جو خدا نے ان کو عطا فرمائی تھی۔ اور اسپر وہ قانع تھے۔ اور اسکے مقابلہ میں کائنات کی۔

حسرت کا عزم و استقلال اور ایثار و فدویت

ہر قیمتی سے قیمتی چیز کی طرف سے انہوں نے اپنی چشم قناعت پسند کو بند کر لیا۔ ہوس جاہ اور طلب نام و نمود کے مکروہ جذبات سے حسرت کا قلب پاک کبھی آشنا نہیں تھا۔ ان کا باطن خود ان کے اور دوسروں کے لئے آئینہ سے زیادہ پاک و صاف ہے۔ صدق و صفا نہ صرف ان کے اوصاف [illegible] ہیں [illegible] پوری میں شاید ہی ایسی مثالیں مل سکیں جن میں مزاج کی سادگی کے ساتھ حوصلہ کی بلندی یقین کی استواری حق پسندی دحق شعاری خلوص و تقوی اور ایثار و فدویت کے اعلیٰ اوصاف

وکریمانہ اخلاق حسرت سے زائد یا حسرت کی برابر پائے جاتے ہوں۔ ان کے ایثار
کامل کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ باوجود ہر قسم کی قابلیتوں کے اور
بیشمار گردو پیش کے خارجی و اندرونی ترغیبوں کے انھوں نے وجاہت طلبی کی طرف
سے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور قومی خدمت گذاری کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار
دے کر اپنی معاشرتی دنیا کو قانعانہ اور متوکلانہ طریق پر نہایت محدود و مختصر کرلیا۔
اور چونکہ انھوں نے اپنی ضروریات کو بہت محدود کرلیا ہے۔ اسلئے مدنیت کے غیر
ضروری لوازمات کے لئے وہ کسی دوسرے کے محتاج نہیں ہوتے اور اس استغنا و
بے نیازی کا اثر ان کے قوت ضمیر و جراءت صداقت اور بے باکانہ اظہار رائے پر پڑتا
ہے یعنی کوئی خارجی طاقت ان کو متاثر و مرعوب کرنے میں کامیاب نہیں ہوتی۔

حسرت کے ایثار کا صحیح اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کی آمدنی ابتدا سے
اسوقت تک کبھی شاید پچاس روپیہ سے زائد نہیں ہوئی۔ سودیشی اسٹور قائم کرنے سے
پہلے تو اردوئے معلی کی محدود آمدنی پر مولانا قانع تھے اور اردوئے معلے کی اشاعت پانچسو
سے کبھی زائد نہیں ہوئی۔ جن لوگوں کو اخباری تجربہ ہے وہ جانتے ہیں کہ اس قدر محدود
اشاعت میں کس قدر آمدنی ہو سکتی ہے۔ بس یہی ایک آمدنی تھی جسپر حسرت اپنے اہل و
عیال کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے جیل جانے کے بعد اردوئے معلی بند ہو گیا اور
یہ تھوڑی بہت آمدنی بھی جاتی رہی۔ اسوقت خدا ہی کو معلوم ہے کہ بیگم صاحبہ حسرت موہانی
اور انکی شیرخوار بچی نے کیونکر دن گذارے۔

اس کے علاوہ نہایت قیمتی کتب خانہ تلف کردیا گیا۔ اور پانچسو روپیہ جرمانہ
کے دوسری قلیل آبائی جائداد سے ادا کرنا پڑے۔

جیل سے رہا ہونے کے بعد ان کے پاس معاش کا کوئی سامان نہ تھا یہ وہ زمانہ
تھا جبکہ حسرت کے سایہ سے لوگ بھاگتے تھے ان کے ساتھ ہمدردی کرنا اور انکو کسی قسم

کی امداد بہم پہونچانا تو ایک بڑی بات تھی۔ اکثر لوگ ان کو پالٹیکس سے باز رہنے کی فہمایش کرتے تھے۔ اکثر کمزور طبا لوگوں نے ان سے ملنا جلنا ترک کر دیا تھا۔ غرضکہ ملک و قوم کی طرف سے ان کے اس ایثار و فدویت کی کوئی قدردانی نہیں کی گئی بلکہ ان کی روش کی ہمیشہ تضحیک کی گئی۔ اور ان کو ہندوؤں کا غلام اور مسلمانوں کا نادان دوست کہا گیا لیکن باوجود ان باتوں کے اس مرد حق نے کبھی اپنے عزائم و آرا سے ایک قدم پیچھے نہیں ہٹایا۔ اور حق پرستی کی جو روش ابتدا سے انھوں نے اپنے لئے منتخب کرلی تھی اسپر نہایت سختی سے ہمیشہ قائم رہے۔ اس پالیسی کی وجہ سے حسرت ہمیشہ مخفی و علانیہ صعوبات میں مبتلا ہوتے رہے۔ لوگوں نے ان کی فقیرانہ زندگی کو بھی رواداری کے ساتھ نہیں دیکھا۔ اور اس عالم فقر میں بھی طرح طرح کی مشکلات ان کے راستہ میں حائل کرتے رہے۔ چنانچہ قید فرنگ سے ۔۔۔ آزادی ملنے کے بعد علیگڑھ کالج کے طلبا کو ان سے ملنے کے لئے روک دیا گیا۔ یہاں تک بھی کوئی مضایقہ نہ تھا مگر بغض و عناد کی دوسری منزل دنایت اخلاق کی نہایت ذلیل مثال ہے یعنی جب مولانا حسرت نے سودیشی اسٹور قائم کیا تو اور زیادہ قدغن کر دیا گیا کہ ہرگز کوئی طالبعلم نہ حسرت سے ملے نہ ان کے اسٹور سے کوئی چیز خریدے۔ یہاں تک کہ کسی دوسرے ذریعہ سے بھی ان کے یہاں سے کوئی چیز نہ منگوائی جائے ؎

اگر ارکان کالج حسرت کی زہریلی صحبت سے طلبا کالج کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ اور مسلمہ چالیس سالہ عہد وفا کو اس صورت میں قائم رکھنا مقصود تھا تو یہ چنداں حرج کی بات نہ تھی۔ اسلئے کہ ہر شخص کو اپنی پالیسی پر نیک نیتی کے ساتھ عمل کرنے کا حق حاصل ہے۔ لیکن اپنے مخالف عقائد ہستی کو نقصان پہونچانا کسی قوم کا قانون اخلاق جائز نہیں رکھتا ظاہر ہے کہ علیگڈھ میں اہل تجارت کی آمدنی کا بڑا ذریعہ کالج ہے خصوصاً کپڑے موزے ٹوپیاں بنیان۔ تولیے اور اس قسم کی دوسری چیزیں

کی نکاسی جس قدر تنہا کالج میں ہوتی ہے شاید تمام شہر علی گڑھ میں نہ ہوتی ہوگی۔ باوجود
حسرت کے خلاف ارکان کالج کا ایسا طرز عمل اختیار کرنا کہ طلبا اپنے ملازمین اور دیگر
ذرائع سے بھی حسرت کی دکان سے خرید و فروخت نہ کرا سکیں۔ صریح ظلم و زیادتی ہے
مگر حسرت نے پبلک طور پر کبھی ان باتوں کا اظہار نہیں کیا اور ہمیشہ خندہ پیشانی کے ساتھ
ان مشکلات کو برداشت کرتے رہے۔ ارباب استبداد کے اس طرز عمل سے حسرت
کو جس قدر نقصان پہنچا ہوگا وہ ظاہر ہے۔ حسرت کے بعض احباب نے اس حالت کو
دیکھ کر مشورۃً ان سے عرض کیا کہ آپ علیگڈھ چھوڑ دیں تو اچھا ہے کیونکہ علیگڈھ کے قیام
میں بجز نقصان کے کوئی فائدہ نہیں ہے مگر حسرت نے اسکو منظور نہیں کیا۔ اور اسکو
کمزوری پر محمول کر کے اس سے انکار کر دیا اور برابر نقصان برداشت کرتے رہتے۔

بہر حال جیل سے آنے کے بعد حسرت نے پھر دوبارہ اردوئے معلیٰ کو جاری
کیا۔ مگر چونکہ اب کوئی سرمایہ ان کے پاس باقی نہیں رہا تھا اور حکومت کے لطف و مہربانی
نے ان کی مالی حالت اس قابل نہیں رہنے دی تھی کہ وہ اردوئے معلیٰ کو پھر اسی سابقہ
شان سے نکال سکتے۔ اسلئے مجبوراً ان کو اردوئے معلیٰ کا سائز حجم اور اسی کے ساتھ
اسکی قیمت کم کرنی پڑی یعنی صرف ایک روپیہ قیمت رکھی۔ ابتدا میں تو ساڑھے سات سو
خریدار ہو گئے مگر بعد میں اکثر لوگوں نے کمزوری طبیعت کے باعث خریداری ترک کر دی
چنانچہ تھوڑے دنوں کے بعد پھر وہی پانچسو اشاعت رہ گئی۔ گویا سال بھر میں صرف
پانچسو روپیہ حسرت کے ہاتھ میں آتے تھے۔ جس میں سے خود اردوئے معلیٰ کے سال
بھر کے مصارف بھی شامل تھے۔ اگر ان مصارف کو منہا کر کے خالص آمدنی حسرت
کی دیکھی جاتی تو شاید دس بارہ روپیہ ماہوار سے کسی طرح زائد نہیں ہو سکتی۔
مگر اس حالت میں بھی حسرت خوش رہے نہ کبھی کسی سے امداد و اعانت کے خواستگار ہوئے
اور نہ قوم و ملک ہی کی طرف سے کوئی حوصلہ افزائی ان کی کی گئی۔

کیا اس دور حرص و ہوا اور اس عہد زر و ریا میں ایسی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں کہ اس قدر مصائب و مشکلات کے باوجود وہ اپنے کسی ایسے عقیدہ پر قائم رہے ہوں جن میں ان کا کوئی ذاتی مفاد متعلق و وابستہ نہ ہو۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ایسی مثالیں موجود ہی نہیں ہیں لیکن اسمیں کلام نہیں کہ مسلمانوں میں بہت ہی کم ایسی مثالیں پائی جاتی ہیں خصوصاً آج سے پانچ سات برس قبل تو کم از کم ظاہری اسٹیج پر حسرت کے ایثار و فدویت کی کوئی مثال موجود نہ تھی۔

یہ ایسے حالات ہیں اور ابتلاء و آزمائش کا وہ نازک دور ہے جہاں بڑے بڑے مدعیان عزم و ثبات کے قدم صراط مستقیم سے ڈگمگا جاتے ہیں مگر کوہ وقار اور گرامی قدر حسرت کا پائے عزم و ثبات جس جگہ پہلے دن تھا آخیر وقت تک وہیں جما رہا۔ اور مشکلات کا کوئی طوفان اور طاقت کا کوئی دباؤ اسکو اپنی جگہ سے ہٹا نہیں سکا۔

سودیشی تحریک اور حسرت

مولانا حسرت سودیشی تحریک کے ابتدا ہی سے حامی و مؤید تھے اور ہمیشہ اس تحریک کو وسعت و فروغ دینے میں ساعی و خواہشمند رہے وہ سودیشی تحریک کو ہندوستان کی اقتصادی ترقی کا واحد ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ایسی حالت میں نا ممکن تھا کہ اس قدر مفید و سود مند تحریک کو کامیاب بنانے میں انکا دست عمل حرکت نہ کرتا۔

دنیا جانتی ہے کہ حسرت کا وجود اک پیکر عمل ہے ان کے مذہب میں عقیدہ کا تعلق صرف قلب ہی سے نہیں ہے۔ بلکہ وہ اسکو اک مرئی شکل میں دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ اس تحریک کے متعلق بھی ان کی کوشش ہمیشہ یہی رہی کہ جس قدر ممکن ہو اسکی وسعت تمام ہندوستان کو اپنی آغوش میں لے لے۔ اس میدان میں سب سے پہلا قدم ان کا خود اپنے نفس اور اپنے متعلقین کی طرف بڑھا یعنی

سب سے پہلے انہوں نے خود اپنے اور اپنے متعلقین کے اوپر غیر ملکی مصنوعات کو حرام کرلیا اسکے بعد اس تحریک کو وسعت دینے میں مصروف ہوگئے۔ چنانچہ آپ کی سعی و کوشش سے کم از کم اسلامی حلقہ میں اس تحریک کو بہت کچھ ہر دلعزیزی حاصل ہوئی۔ بہت سے لوگوں پر صرف آپ کی مخلصانہ عملی زندگی کا اثر پڑا بہت سے لوگ آپ کے وعظ و نصیحت اور تقریر و تحریر سے متاثر ہوئے اور اس تحریک کو کامیاب بنانے میں عملاً شریک ہوگئے۔ ایسے لوگوں کی تعداد تو بہت ہے جنہوں نے کم از کم خود ملکی مصنوعات کو استعمال کرنا اور غیر ملکی مصنوعات پر اسکو ترجیح دینا شروع کردیا۔

لیکن حسرت کی عملی زندگی یہاں پر آن کر ختم نہیں ہوگئی بلکہ انہوں نے اس تحریک کو زیادہ وسیع پیمانہ پر کامیاب بنانے کی تدابیر اختیار کیں۔ یعنی انھوں نے کوشش کرکے ایک سودیشی اسٹور قائم کردیا اسمیں روزمرہ کی تمام ضروریات انھوں نے فراہم کرلیں

حسرت نے یہ سودیشی اسٹور کچھ اپنے ذاتی سرمایہ سے نہیں کھولا تھا یعنی ان کے پاس اس قدر سرمایہ کبھی تھا نہ ہے کہ وہ اوسط پیمانہ پر بھی کوئی دوکان جاری کرسکتے بلکہ وہ مولانا شبلی و نواب وقارالملک کی وساطت سے سر فاضل بھائی کریم بھائی سے ملے اور مولانا کی سفارش سے سر فاضل بھائی سے قرض کپڑا خرید ا۔ اسی طرح دوسری چیز میں دوسرے تھوک فروشوں سے قرض خرید یں۔ اس شرط پر کہ فروخت کرکے ادا کرینگے اور پھر خریدینگے۔ سر فاضل بھائی کے نام نواب وقارالملک بہادر مرحوم نے بھی ایک سفارشی تحریر حسرت کو لکھدی تھی۔

غرضکہ ان کوششوں سے آپ نے سودیشی اسٹور کھولدیا اور رفتہ رفتہ تمام ضروریات کی چیزیں اسمیں مہیا کرلیں۔ چونکہ حسرت کی طبیعت سراپا استقلال ہے اس لئے اس کام کو بھی اس قدر مستقل مزاجی اور محنت کے ساتھ آپ نے انجام دیا کہ یہ دوکان چل نکلی اور خاصی کامیابی اسمیں حاصل ہوئی۔ متعدد بار تھوک فروشوں کا قرض ادا کیا اور ان سے

مال منگوایا۔

چنانچہ حسرت کی اس تجارتی سرگرمی کو دیکھ کر مذاقاً مولانا شبلی مرحوم نے فرمایا تھا کہ "تم آدمی ہو یا جن۔ پہلے شاعر تھے پھر پالیٹیشن بنے اور اب بنئے ہو گئے"

شاید آپ خیال کرتے ہوں گے کہ حسرت کا جوشِ عمل اب اس منزل پر ضرور ختم ہو گیا ہو گا لیکن یقین کیجئے کہ حسرت کی نسبت ایسا خیال کرنا ان کے ولولۂ عمل و جذبۂ صادق کی توہین کرنی ہے۔ حسرت کی مساعی یہیں تک محدود نہیں رہیں۔ بلکہ انہوں نے اس تحریک کو مزید وسعت دینے کے لیئے اکثر مقامات کے دورے کئے اور وہاں جاجا کر اس تحریک کی خوبیاں لوگوں کے ذہن نشین کرائیں اور تجارتی نفع کا یقین دلا کر بہت سے قصبات اور شہروں میں سودیشی دوکانیں کھلوادیں جو اب تک کامیابی کے ساتھ چل رہی ہیں۔

غرضکہ حسرت ملک کی اقتصادی حالت کے درست کرنے میں بھی بالکل اسی طرح سرگرمی سے ساعی رہے۔ جس طرح وہ میدان سیاست میں سرگرم کار تھے اور انکا یہ سلسلہ ۱۹۰۵ء سے جاری ہے یعنی انڈسٹریل کانفرنس میں وہ ۱۹۰۵ء سے شریک رہا ہیں۔ بیگم صاحب حسرت موہانی فرماتی ہیں کہ حسرت کا قطعی ارادہ ہے کہ وہ اس صوبہ کے ہر ضلع میں سودیشی اسٹور قائم کر کے رہیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ +

تعلیمی تحریک اور حسرت کی مساعی

مولانا حسرت کی نسبت عام طور پر لوگوں کو صرف اس قدر معلوم ہے کہ وہ ایک اچھے شاعر اور انتہا پسند پالیٹیشن ہیں۔ لیکن صرف سیاست و ادب کے اندر ان کے مساعی زندگی کو محدود کر دینا ان کی دیگر خدمات جلیلہ کی حق تلفی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اصلاح ملک کی تمام تحریکوں سے انکا تعلق ہے۔ البتہ بعض کے ساتھ خصوصیت اور لگاؤ ہے۔ بعض کے ساتھ کم۔ تاہم تعلیمی تحریک ایسی چیز نہیں کہ

حسرت اسکو پوری اہمیت نہ دیتے ہوں ان کو مسلمانوں کی تعلیمی تحریک سے بھی اسی درجہ کا اعتناء ہے جس قدر سیاست وغیرہ سے چنانچہ مسلم یونیورسٹی کے مسئلہ میں ان کی مساعی و انہماک سے سارا ملک واقف ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے قوم کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اور عام جذبات کے احترام کرنے پر یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد کو انھوں نے بارہا مجبور کیا ہے۔

حسرت کا خیال ہے کہ اسوقت جمہور اہل اسلام کو ثانوی تعلیم کی سخت ضرورت ہے تاکہ عام طور پر مسلمان صنعت وحرفت اور تجارت وزراعت وغیرہ میں شریک ہوسکیں اس خیال کی بنا پر وہ اسکولوں کے قیام کالجوں سے بھی زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔ اور اس خیال کی بنا پر وہ اسکولوں کے الحاق کے بغیر مسلم یونیورسٹی کو مفید نہیں سمجھتے چنانچہ حسرت نے آخر وقت تک اس امر کی کوشش کی کہ جب تک آزاد یونیورسٹی نہ ملے۔ اسوقت تک گورنمنٹ کے محدود وغیر آزادی بخش چارٹر کو قبول نہ کیا جائے حسرت جس خیال کی بنا پر اس امر کے ساعی رہے۔ وہ تنہا انہیں کا خیال نہ تھا بلکہ فی الحقیقت وہ جمہور کی ترجمانی کر رہے تھے۔ کیونکہ جمہور ملت کے خیالات و مطالبات یہی تھے کہ جب تک آزاد یونیورسٹی نہ ملے اسوقت تک وہ غیر مفید ہے اور اسلئے ایسی یونیورسٹی قبول نہ کرنی چاہیئے۔

جسوقت تک مسٹر محمد علی اور مولانا ابوالکلام آزاد نظر بند نہیں ہوئے اسوقت تک یونیورسٹی کے متعلق حسرت کی جد وجہد زیادہ وسیع نہ تھی کیونکہ یہ دونوں کام کرنے والے بزرگ موجود تھے۔ تاہم مقامی حیثیت سے کبھی غافل نہیں رہے اور ان مجالس میں جو مسئلہ مذکور کے متعلق وقتاً فوقتاً منعقد ہوتی رہیں ہمیشہ پورے جوش و اعتماد کے ساتھ اس میں شریک ہوئے۔ اور اس امر کی کوشش کی کہ عام اسلامی جذبات کو پامال نہ ہونے دیا جائے۔ لیکن جب سے مولانا ابوالکلام اور مسٹر محمد علی نظر بند ہوئے

اسوقت سے مولانا حسرت نے اپنی جد و جہد کی رفتار کو زیادہ سریع و تیز کر دیا اور نہایت سرگرمی کے ساتھ اس بات کی کوشش میں مصروف ہو گئے کہ کوئی ایسا فیصلہ نہ کرلیا جائے جو عام رائے کے خلاف ہو۔

چنانچہ جب لکھنؤ میں فاؤنڈیشن کمیٹی کا جلسہ طلب کیا گیا اور مولانا نے دیکھا کہ عام رائے اور جماعت احرار کو کوئی سپورٹ کرنے والا نہیں تو مولانا نے اس غرض کو پورا کرنے کی خاطر ایک وسیع دورہ کیا اور اس سفر میں کثرت سے لوگوں کو فاؤنڈیشن کمیٹی کے جلسہ میں شرکت کے لئے آمادہ کیا چنانچہ مولانا حسرت کی اس جد و جہد اور سعی و کوشش کا یہ نتیجہ نکلا کہ احرار کو شکست فاش ملنے سے رہ گئی۔ حالانکہ افواہاً مشہور تھا کہ اس مرتبہ میدان صاف ہے لہذا پالا ارباب استبداد کے ہاتھ رہے گا۔ مگر الحمد للہ کہ جب تک حسرت آزاد رہے اسوقت تک اس کا کوئی موقع ارباب حل وعقد کو نہیں ملا۔ اگرچہ اسکے بعد جب ابوالکلام محمد علی اور حسرتؔ جیسے مقتدایان ملت نہ رہے تو پانسہ پلٹ دیا گیا۔

بہرحال حسرت کا تعلیمی شوق و انہماک بھی دوسرے مشاغل سے کم نہ تھا۔ مولانا حسرت اپنے اِس خیال کے مطابق کہ مسلمانوں کو ثانوی تعلیم کی زیادہ ضرورت ہے یہ مصمم ارادہ کئے ہوئے ہیں کہ انشاء اللہ ہر ضلع اور قصبہ میں وہ ایک اسلامی درسگاہ قائم کرا کے رہیں گے۔ خدا ہم چنیں کند ؎

ہمت بلند دار کہ نزد خدا و خلق　　باشد بقدر ہمت تو اعتبار تو

معاشرتی امور میں بیگم صاحبہ حسرت موہانی تحریر فرماتی ہیں کہ حسرت کو اصلاح تمدن کے تمام مسائل سے اتفاق کامل ہے۔ البتہ رسم پردہ کے متعلق ان کا عقیدہ اور عمل دونوں رواج عام کے خلاف ہیں۔ حسرت ہندوستان کے موجودہ اور مروجہ طرز کے پردہ کو کوئی مذہبی فرض نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک چہرہ اور ہاتھ داخل ستر نہیں اسلئے ان کا چھپانا بھی مذہباً لازمی نہیں ہے۔ تاہم اہل ہند کی اخلاقی حالت کے لحاظ سے وہ جمہور ملت کے

لئے رسمًا و مصلحتاً نہ کہ مذہبًا پردہ کو جائز سمجھتے ہیں البتہ خود اعلیٰ کے لئے جن کو کسی قسم کے فساد کا اندیشہ نہ ہو وہ پردے کو بیکار سمجھتے ہیں اور اپنے اس خیال پر عمل بھی کرتے ہیں۔ جیسا کہ ان کے سب مخلص دوستوں کو معلوم ہے اس موضوع پر ایک مدلل مضمون شائع کرنے کا قصد بھی ہے۔ جس کی نسبت ان کا خیال ہے کہ اس کے مطالعہ کے بعد سخت سے سخت حامی پردہ بھی اپنے قدیم عقیدہ پر قائم نہ رہ سکے گا۔

خیر یہ موقعہ اس بحث کا نہیں ہے مگر چونکہ بیگم صاحب حسرت موہانی نے تاکیداً تحریر فرمایا ہے کہ حسرت کے اس عقیدہ کا اظہار ضرور کر دیا جائے۔ اسلئے یہ چند سطور لکھی گئیں۔

مولانا حسرت کا مذہب و مشرب

مولانا حسرت موہانی جس طرح اپنے سیاسی عقائد میں نہایت مستحکم اور مضبوط ہیں اسی طرح مذہبی اعمال و عقائد میں بھی کمال درجہ شغف و توغل رکھتے ہیں اور اپنے کلام میں جا بجا اپنے ہر قسم کے معتقدات کو ظاہر کرتے رہتے ہیں۔

مذہبًا مولانا حنفی ہیں اور مشربًا قادری اور اس خانوادہ کے رکن اول و اعلیٰ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کی عقیدت و ارادت عشق کے درجہ پر پہنچی ہوئی ہے جس کا اظہار متعدد غزلوں میں آپ نے کیا ہے۔ مثلاً ایک پوری غزل حضرت غوث پاک کے متعلق ہے فرماتے ہیں:۔

دستگیری کا طلبگار ہوں شیئاً للہ — میر بغداد میں ناچار ہوں شیئاً للہ

حال دل شرم سے ابتک نہ کہا تھا لیکن — آج میں در پئے اظہار ہوں شیئاً للہ

کرم خاص کے لائق تو نہیں ہیں پھر بھی — آپکا غاشیہ بردار ہوں شیئاً للہ

آپ ہی سینئے کہ اب اور کہوں میں کس سے — بستۂ دامن سرکار ہوں شیئاً للہ

مجھ سے اب دین کی پستی نہیں دیکھی جاتی — نالۂ کفر سے بیزار ہوں شیئاً للہ

پائے رفتن ہی نہ ہے ہند میں جا کا مازن　　سخت مشکل میں گرفتار ہوں شیئاً للہ

غوث اعظم سے جو مانگو گے ملے گا حسرت
بس کہو جا کے سر دربار ہوں شیئاً للہ

ایک دوسری نعتیہ غزل میں فرماتے ہیں۔

رہنمائے گمرہان و سرگروہ مقبلان　　عاشق و معشوق یزدان جان و جانان رسولؐ
مقتدائے سالکان و مخزن اسرار حق　　پادشاہ عاشقان و گنج عرفان رسولؐ
نور چشم فاطمہ مہر درخشان علی　　غوث اعظم شاہ جیلاں ماہ تابان رسولؐ

حسرت محروم ہے امیدوار التفات
اس طرف بھی اک نظر اے میر سامان رسولؐ

ان دونوں غزلوں سے میر بغداد کے حضور میں آپ کی ارادتمندی و فرط عقیدت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

مولانا نے بچپن ہی میں مولانا شاہ عبدالرزاق صاحب فرنگی محلی سے بیعت کی تھی اسکے بعد آپکے صاحبزادے یعنی مولانا عبدالباری صاحب کے والد ماجد سے پھر تجدید بیعت کی۔ یہ خاندان قادری المشرب ہے اسی سلسلہ میں حضرت شاہ عبدالرزاق صاحب کی نسبت ایک غزل میں فرماتے ہیں۔

اک خلش ہوتی ہے محسوس رگ جاں کے قریب　　آن پہنچے ہیں مگر منزل جاناں کے قریب
حشر میں اپنے گناہوں سے مجھے خوف ہو کیا　　ان کی رحمت بھی تو ہے منزل عصیاں کے قریب
لپٹے اس ڈھب سے کہ پھر ہو نہ جدا خاک مری　　کہیں پہنچے بھی تو اس گوشہ داماں کے قریب
لکھنؤ آنے کا باعث یہ کھلا آخر کار　　کھینچ لایا ہے دل اک شاہد پنہاں کے قریب
وہ جو ہیں پاس تو محبس بھی ہے اک باغ ہمیں　　کامرانی بھی نمودار ہے حرماں کے قریب
روز جاتی ہے دیار میں یار حسرت　　آستان شہ رزاق ہو زنداں کے قریب

یہ غزل مولانا نے اسوقت لکھی تھی جبکہ آپکا تبادلہ فیض آباد جیل سے لکھنؤ سنٹرل جیل میں ہوا تھا۔ آستانۂ شہ رزاق سے مراد حضرت شاہ عبدالرزاق صاحب ہیں اور مقطع سے پہلے شعر میں باغ سے مراد درگاہ شریف ہے جوکہ مولوی انوار کا باغ کے نام سے مشہور ہے۔

مولانا کو تصوف کے ساتھ ایک غیر معمولی لگاؤ ہے چنانچہ غزلوں میں اکثر اسکا اظہار فرمایا ہے۔

کچھ بھی حاصل نہ ہوا زہد سے نخوت کے سوا
شغل بیکار ہیں سب انکی محبت کے سوا

دے سکا کوئی نہ دہری کے وساوس کا جواب
تیرے دیوانۂ وارفتہ طبیعت کے سوا

قول زاہد کو غلط ہم نہیں کہتے ہیں مگر
اور کچھ ہو بھی طریقت میں شریعت کے سوا

اہل ظاہر نہ کریں کوچۂ باطن کی تلاش
کچھ نہ پائیں گے وہاں رنج و مصیبت کے سوا

سب سے منہ موڑ کے راضی ہیں تری یاد پہ ہم
اسمیں اک شانِ فراغت بھی ہے راحت کے سوا

نعت میں بھی کئی غزلیں موجود ہیں اور اہل بیت اطہار سے بھی خاص تعلق خاطر ہے جسکو ایک غزل میں ظاہر کیا ہے جسکی ردیف و قافیہ "جان اولیا بستان اولیا" ہے۔ تصوف سے یوں تو فطرۃً مولانا کو خاص تعلق تھا لیکن موجودہ قید فرنگ میں اس رنگ نے اور بھی پختگی اختیار کر لی ہے۔ حسرت کا قول ہے کہ تصوف جانِ مذہب ہے اور عشق جان تصوف۔ العشق ھو اللہ ھو اللہ ھو اللہ کا اکثر ورد رکھتے ہیں۔ یہ مذاق اس قدر طبع حسرت پر غالب ہے کہ ان کے کلام میں ہر جگہ اسکی جھلک آپ کو نظر آ سکتی ہے۔

متفرق حالات

قبل اسکے کہ ہم موجودہ نظر بندی زندان کے مسئلہ پر بحث کریں چند

متفرق امور کا ذکر کر دینا مناسب خیال کرتے ہیں یہ متفرق حالات و واقعات خود بیگم صاحب کی ایک تحریر سے ماخوذ ہیں وہ فرماتی ہیں :-

لاہور اور بنارس کے مقدمات سازش میں بعض سرکاری گواہوں نے شرارت سے حسرت کا نام بھی اپنے بیان میں لیا اسکے متعلق لوگوں نے حسرت سے بہت کچھ اصرار کیا کہ تم اپنی وفاداری کا بیان پانیر وغیرہ میں شائع کرادو۔ تاکہ گورنمنٹ کا شبہ رفع ہو۔ مگر حسرت نے اپنی خودداری کو ہاتھ سے نہیں دیا اور خاموش رہے۔

اس سلسلہ میں ایک بے بنیاد افواہ یہ بھی مشہور ہے کہ لارڈ منٹو پر بم پھینکنے سے انھوں نے کسی انارکسٹ کو باز رکھا مسز حسرت فرماتی ہیں کہ یہ بھی بالکل غلط ہے۔

مولانا حسرت فرماتے ہیں کہ میں نے کوئی امتحان ایسا نہیں دیا کہ جسکے بعد کامیابی کا مجھے یقین نہ ہو۔ چنانچہ علی گڈھ کالج سے بی اے کا امتحان دیتے ہی نتیجہ کا انتظار کئے بغیر اردوئے معلی کا اشتہار شائع کر دیا تھا۔

اردوئے معلی نے پالٹیکس میں اسوقت سے حصہ لینا شروع کر دیا تھا جبکہ اس خیال کو سخت ترین معصیت سمجھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اس وقت مسلمانوں میں حسرت کا ایک بھی ہمخیال نہ تھا۔ الا ماشاء اللہ۔ مسٹر مظہر الحق اسوقت صفی پور میں منصف تھے اور پالٹیکس میں حصہ لے بھی نہیں سکتے تھے حسرت سے ان کی شناسائی ادبی تحریک کی بنا پر ہوئی تھی۔ مسٹر محمد علی بھی ۱۹۱۲ء تک حسرت سے اختلاف رکھتے تھے۔ غرضکہ عام طور سے حسرت کی پالیسی سے مسلم لیڈروں کو اختلاف تھا۔ البتہ صرف ایک مولانا شبلی مرحوم تھے جنہوں نے ابتدا ہی سے حسرت کی تائید اور ۱۹۰۳ء میں اردوئے معلی کا پہلا سیاسی مضمون دیکھکر

داد دی تھی اور لکھا تھا ؂

انچہ گفتی حکایت سحر است   روز روشن ہنوز در قدر است

ذیل کے دو اتفاقی واقعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ایک تو یہ کہ علی گڈھ کالج میں حسرت ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کے خاص اصرار اور تحریک سے آئے اور آخر تک ریاضی کو نہ چھوڑا۔ یہاں تک کہ بی اے ریاضی میں پاس کیا دوسرے یہ کہ اردوئے معلی میں سب سے پہلا سیاسی مضمون شیخ عبد اللہ صاحب نے لکھا۔ مگر اب یہی دونوں بزرگ علی گڈھ میں حسرت سے سب سے زیادہ اختلاف رکھتے ہیں۔

مولانا حسرت کی حسن نیت اور خلوص وللّٰہیت کا اندازہ ان کے ذیل کے مقولے سے ہو سکتا ہے۔ ان کا قول ہے کہ ان کی مختلف لوگوں سے مختلف حیثیتوں سے ملاقات ہے وہ سب کے دوست ہیں۔ کسی کے دشمن نہیں اور نہ ان کا کوئی دشمن ہے یہ آخری جملہ گو صحیح نہ ہو مگر مولانا حسرت کے اعلیٰ اخلاق اور ان کے حسن نیت پر دال ہے۔

حسرت کی ادبی خدمات

حسرت کی ادبی خدمات اس قدر روشن اور واضح ہیں کہ ان کا ذکر کرنا تحصیل حاصل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا انھوں نے اردوئے معلی کے ذریعہ اردو لٹریچر کی نہایت گرانقدر خدمات انجام دی ہیں خصوصاً اردو شاعری پر انھوں نے احسان عظیم کیا ہے سینکڑوں غیر معروف شعراء کے حالات اور شاعری سے لوگوں کو آگاہ کیا اور انکے کلام سے لوگوں کو روشناس کرادیا بہت سے اساتذہ کے کلام کو تلف ہونے سے بچالیا۔ شعراء کے تذکرے مرتب کرکے شائع کئے اور ان کے کلام پر تنقید یں لکھیں جس سے پاکیزہ مذاق سخن کی اشاعت ہوئی اور کثرت سے لوگ صحیح مذاق سے آشنا ہوگئے۔ ان [illegible] تو صرف حسرت

کی شاعری اردو لٹریچر کے لیے مایۂ ناز اضافہ سے تعبیر کی جاسکتی ہے۔ ہم یہاں حسرت کی شاعری پر تنقید ذکر ینگے اگر ممکن ہوا تو اخیر میں بعض سیاسی مضامین کے اشعار کا انتخاب درج کریں گے۔ فی الحال ادبی تحریک کے متعلق صرف اسی قدر لکھنے پر ہم اکتفا کرتے ہیں۔

حسرت کی چند خصوصیات

ایک بزرگ و قابل فرزانہ انسان میں جس قدر خوبیاں اور محاسن ہونی چاہئیں وہ سب حسرت کی ذات میں بوجہ اتم پائی جاتی ہیں اور اسلامی اخلاق و فضائل کے تمام صفات حسنہ کے وہ دور موجود ہیں مکمل نمونہ ہیں مثلاً صدق و خلوص زہد و ورع دیانت و تقویٰ عزم و استقلال ایثار و فدویت یہ تمام باتیں بفضلہ حسرت میں واقعی طور سے موجود ہیں اور صرف کہنے کے لیے اور محض اسٹیج پر ان کی نمایش کرنے کے لیے نہیں ہیں بلکہ حقیقتاً اور واقعتاً وہ ان تمام صفات حسنہ سے موصوف و متصف ہیں اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ان کا بدترین مخالف بھی انکی انہیں خوبیوں کی بنا پر ان کا احترام کرتا ہے۔

حسرت کی ذات اپنے اندر ایک نمایاں خصوصیت رکھتی ہے اور وہ یہ کہ سوائے اختلاف رائے کے اور انکی کسی بات سے لوگوں کو اختلاف نہیں اور نہ اخلاقی حیثیت سے ان پر آج تک کسی نے کوئی اعتراض کیا۔ تمام ملک انکی حسن نیت کا قائل اور ان کے خلوص و للہیت کا معترف ہے اور انکی حریت پسندی و وطن پرستی کے جذبات کو حب جاہ او طلب نام و نمود وغیرہ سے بالکل منزہ اور پاک سمجھتا ہے اور ہر شخص ان کی سچائی کا معترف ہے۔

حسرت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ تمام اسلامی ہند میں سب سے پہلے جس

شخص کے پاؤں میں وطن پرستی کے جرم بے جرمی میں مقدس بیڑیاں ڈالی گئیں وہ اس
دیوانہ حریت و آزادی یعنی حسرت موہانی کا پاؤں تھا۔

تیسری خصوصیت ان کی یہ ہے کہ وہ اس وقت سے راہ حق اور صراط مستقیم پر
چل رہے ہیں جبکہ سیاسی عقائد کے لحاظ سے تمام اسلامی ہند گمراہ تھا۔ اس کا
ثبوت یہ ہے کہ آج انہیں کی پالیسی پر تمام لوگ عامل ہیں یہ انکی سچائی اور ان کے عقیدہ
کی استقامت کی نہ صرف دلیل ہے بلکہ یہ ان کی فتح ہے جس پر حسرت جس قدر
چاہیں فخر کر سکتے ہیں کہ اولیت کے مجرد شرف کے لیے خداوند قدوس کے دست
قدرت نے ان کو چن لیا تھا۔ گویا ضلالت و گمراہی سے کبھی ان کا قلب آشنا نہیں ہوا
اور اول دن ہی سے وہ مومن و مسلم تھے یعنی ایسا نہیں ہوا کہ پہلے وہ غلامی پسند
و استبداد دوست ہوں بعد میں واقعات و تجارب نے تبدیلی رائے پر ان کو مجبور کر دیا ہو
وہ زمانہ کی کسی انقلابی طاقت سے متاثر نہیں ہوئے بلکہ خود انہیں کے حالات
و کیفیات نے انقلابی صورت پیدا کر دی۔ اور ایک دنیا اس دور انقلاب کے ماتحت آ گئی۔
حسرت جہاں پہلے دن کھڑے تھے وہیں اپنی جگہ پر مضبوطی سے کھڑے رہے، دوسرے
لوگ البتہ نیچے پستی میں استبداد و استعباد کی دلدل میں پھنسے ہوئے تھے انہوں نے
ترقی کی اور حسرت کی برابر آکر کھڑے ہو گئے۔

لیکن باوجود ان تمام محامد و فضائل کے حسرت نے اپنی شخصیت کو ایک لیڈر کی
حیثیت سے کبھی نمایاں نہیں کیا۔ اور نہ کبھی رہنمائی و پیشوائی کی اس عزت کی طرف
ایک قدم بڑھایا جسکے حصول کی آرزو میں سینکڑوں خانہ ساز لیڈر بن گئے۔ آج
تک نہ کبھی ان کی گاڑی کھینچی گئی۔ اور نہ پھولوں کے ہار ان کے گلے میں پہنائے گئے نہ
ان کا کہیں استقبال کیا گیا۔ اور نہ پذیرائی کی تمنا کبھی ان کے دل میں پیدا ہوئی
وہ پیدل چلکر جلسوں میں شریک ہوتے تھرڈ کلاس میں سفر کرتے معمولی سودیشی

کپڑے پہنتے اور معمولی سادہ غذا کھاتے پیتے رہے۔ جو لوگ حسرت کی زندگی سے واقف ہیں ان کو معلوم ہے کہ اس عہد نام و نمود اور اس دور فساد و نفاق میں حسرت کا گرامی قدر وجود اپنے اندر کیسی قدسیت رکھتا ہے۔ اور ان کے اخلاق و صفات کس درجہ متخلق باخلاق اللہ ہیں۔

قانون مطابع کی جابرانہ دست درازیاں جس وقت سے اسلامی ہند پر شروع ہوئیں تو ہندوستان میں سب سے پہلا اسلامی پریس جس پر تلوار چلائی گئی وہ حسرت ہی کا اردو پریس تھا۔ اردو پریس کی تمام کائنات اور ساری حقیقت صرف اسقدر تھی کہ ایک کاٹھ کی دستی مشین اور تین پتھر تھے جس میں دو جزو کا ماہوار اردوئے معلی چھپتا تھا اور بس۔ بسا اوقات ایسا ہوا ہے کہ خود حسرت نے مشین چلائی اور قلیوں کی طرح کام کرکے رسالہ کو اسکے وقت پر شائع کر دیا۔

ایسے بے حقیقت پریس سے جس سے ایک حبہ آمدنی کبھی نہیں ہوئی سر جیمس مسٹن کی گورنمنٹ نے پورے تین ہزار کی ضمانت طلب کرلی۔ یعنی اپنے پورے اختیارات غریب حسرت کے غریب پریس کے برباد کر دینے میں صرف کر ڈالے۔ ایک ایسے پریس سے جسمیں کوئی آمدنی نہ ہوتی ہو اور ایک ایسے شخص سے جو سَو دو سَو روپیہ کا بھی انتظام نہ کر سکتا ہو اس سے تین ہزار کی ضمانت طلب کرلینا سوائے جذبہ انتقام کے اور کس امر پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ اس ضمانت طلبی کا مدعا اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ پریس قطعی طور سے بند کر دیا جائے حالانکہ ضمانت وغیرہ کا لینا صرف اس غرض سے ہوتا ہے کہ آیندہ سے احتیاط کی جائے نہ یہ کہ سرے سے پریس کو غارت کر دیا جائے اسکو کوئی مہذب گورنمنٹ جائز نہیں رکھتی مگر حسرت کے صداقت شعار دل نے اس قربانی کو بھی برداشت کرلیا۔ اور جس شخص کے جذبہ صادق کو زندان فرنگ کی آہنی بیڑیاں زائل نہ کر سکیں اور جو قید کی پرمشقت زندگی

بسر کرنے کے بعد بھی اپنے عقیدہ میں ترمیم کرنے پر مائل نہ ہوا، بھلا ایسے پیکر صدق و صفا اور ایسے مجسم خلوص و وفا کو پریس ایکٹ کی جابرانہ سختیاں اپنی جگہ سے کیا جنبش دے سکتی ہیں۔

چنانچہ حسرت کے قلب پر اس واقعہ کا ذرہ برابر کوئی اثر نہیں ہوا یہ صحیح ہے کہ وہ تین ہزار کی رقم فراہم نہیں کر سکتے تھے اور بالآخر ان کو پریس اور اسکے ساتھ ہی اردوئے معلی بند کر دینا پڑا۔

تاہم انھوں نے آخری پرچہ میں اعلان کر دیا کہ گو اردوئے معلی بند کر دیا گیا مگر میری زبان میرا دل اور میری قوت عمل ہنوز آزاد ہے اور میں جس طرح پہلے کام کرتا تھا اب بھی خدا کی بخشی ہوئی طاقتوں سے کام لوں گا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ طرابلس میں جنگ ہوئی تھی مولانا حسرت نے اٹلی کے خلاف بائیکاٹ کا فتویٰ شائع کیا تھا اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کی تھی بلکہ تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ مسلمانوں کو آپ اس امر پر آمادہ کر رہے تھے کہ وہ اٹلی کا مال خریدنا ترک کر دیں حسرت کی یہ بیباکی گورنمنٹ کو خوش نہیں آئی۔ غالباً اس جد و جہد اور سعی و کوشش کو روکنے کے لئے یہ تدبیر کی گئی تھی۔ مگر گورنمنٹ کے اس طرز عمل سے مولانا حسرت کا جوش عمل اور بھی ترقی پکڑ گیا اور وہ ہمہ تن اس تحریک کو فروغ دینے میں مصروف ہو گئے اور اردوئے معلی کے بجائے تذکرہ شعراء کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ نکال کر ادبی خدمت گزاری کے سلسلہ کو بھی جاری رکھا۔

جنگ طرابلس کے بعد جنگ بلقان شروع ہو گئی اور تمام عالم اسلامی ایک سخت آزمایش میں پڑ گیا۔ مولانا اس زمانہ میں بھی خاموشی کے ساتھ خدمت میں مصروف رہے پھر اسی دوران میں واقعہ مسجد کانپور کا حدوث ہوا اس میں بھی مولانا خاموش نہیں رہے۔

غرضکہ حسرت کی ساری زندگی قوم و ملک کی خدمت گزاری میں بسر ہوئی۔
ان واقعات کے بعد کوئی اہم سیاسی معرکہ پیش نہیں آیا سوائے مسٹر محمد علی
وزیر حسن اور مسٹر امیر علی کے مشہور اختلاف کے اسمیں بھی مولانے مسٹر محمد علی کی
حمایت کی۔

ان واقعات کے بعد مولانا کی تمام تر توجہ سودیشی تحریک کی توسیع و اشاعت
اور مسلم یونیورسٹی کے مسئلہ کی طرف منعطف ہوگئی کیونکہ یہی وہ مسئلہ اسوقت نہایت
اہم اور ضروری تھے۔ انہیں مسائل جہد میں مولانا مصروف تھے کہ موجودہ جہاں سوز
وعالمگیر جنگ شروع ہوگئی۔ اس دوران میں مولانا نے کسی سیاسی معاملہ میں زیادہ
انہماک سے کام نہیں لیا اور دو برس خاموشی کے ساتھ گذارے تھے کہ بالآخر
مصائب و آلام کے ایک نئے باب کا انکی زندگی میں اضافہ کیا گیا۔

ابتلا و آزمائش کا دور ثانی

ایسے عہد تاریک و ظلم اور دور فساد و نفاق میں کہ نئے نئے طریقہ وضع
ہو رہے ہیں۔ اور ظلم و زیادتی کرنے کے لیئے قوانین بنائے جا رہے ہیں حسرت
جیسے پرستار حق و حریت کا آزاد اور ایک سخت گیر حکومت کی گرفت سے ان کا
بچا رہنا تعجب انگیز امر تھا۔
لوگ متحیر تھے کہ آخر مولانا حسرت کو خدمتگذاری حق و صداقت کا معاوضہ
اب تک کیوں نہیں ادا کرنا پڑا وہ حسرت جو قربانگاہ ابتلاء و آزمائش میں ہمیشہ
سب سے آگے رہا اور فدویت و ایثار کے میدان امتحان میں سب پر سبقت لیگیا
وہ آج جبکہ اقلیم صداقت کو ویران کر کے جیل خانہ آباد کئے جا رہے ہیں کیوں دوسروں
سے پیچھے رہ گیا۔ لیکن اسمیں کوئی حیرت و استعجاب کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ جس طرح

وہ ہمیشہ برداشت مصائب و آلام میں دوسروں سے منفرد و ممتاز رہا اسی طرح اس مرتبہ بھی گو قدرے پیچھے رہا مگر تمام پرستاران حریت و آزادی سے وہ ممتاز رہا یعنی دوسرے بزرگان قوم و مصلحان ملک و ملت کی طرح وہ صرف نظر بند نہیں کیا گیا۔ اسکے پاؤں کی حرکت اور زبان کی جنبش کسی ایک شہر کے اندر محدود نہیں کردیگئی بلکہ اسکی حریت پرستی و صداقت کیشی جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی کی مستحق تھی چنانچہ وہ سرگروہ سربازان حریت و صداقت اپنے مرتبۂ اعلیٰ و اقدس کی مطابق جیل میں معتکف ہوا۔

یوں تو مولانا حسرت موہانی کو کامل آزادی کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ یعنی ہمیشہ ہمہ وقت سی۔ آئی۔ ڈی کے آدمی سفر و حضر میں ان کے ساتھ ہی رہا کرتے تھے مگر حسرت کے لیے کوئی قید و بند نہیں تھی کہ اگر کہیں جائیں تو اجازت وغیرہ لیں۔ اسکی کامل نگرانی کی ذمہ واری سی۔ آئی۔ ڈی پر تھی۔ اسی حال میں مولانا اپریل سنہ ۱۶ء تک آزاد رہے لیکن مئی سنہ ۱۶ء میں مسلم یونیورسٹی فاونڈیشن کمیٹی کے جلسہ سے واپس آنے کی دو تین ہی روز بعد پہلے انکی خانہ تلاشی ہوئی اور پھر نظر بندی کا حکم صادر ہوا۔

مولانا نے اس حکم کے خلاف لوکل گورنمنٹ سے خط و کتابت کی اور ایک عرضداشت ارسال کی مگر چونکہ جس وقت حکم سنایا گیا تھا اوسی وقت اوسکو تسلیم کرنے سے انکار کردیا کیونکہ آپ بفتوائے ضمیر ہر ایسے حکم کی پابندی کرنا مذہباً ناجایز سمجھتے تھے جسمیں نہ جرم کی نوعیت سے آگاہ کیا جائے اور نہ ملزم کو صفائی کا موقع دیا جائے۔ غالباً اس بنا پر آپ کو علی گڑھ سے للت پور لے گئے حالانکہ انصافاً مقامی حکام کو یہ حق حاصل نہ تھا۔ کیونکہ مولانا کا معاملہ ابھی لوکل گورنمنٹ کے زیر غور تھا اور وہاں سے کوئی جواب نہیں آیا تھا اور جب تک وہاں سے

جواب نہ آجاتا اسوقت تک مولانا پر عدول حکمی کا مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا تھا لیکن اسکی پرواہ نہیں کیگئی اور لوکل گورنمنٹ کے احکام کا انتظار کئے بغیر مولانا کو ان کی مرضی کے خلاف للت پور بھیجدیا گیا اور وہیں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے اجلاس میں عدول حکمی کا مقدمہ دائر کر دیا گیا اور مجسٹریٹ نے آناً فاناً چند گھنٹوں میں فیصلہ سنا دیا۔ اور تین مختلف الزامات میں دو سال کی قید محض تجویز کر دی۔

اس معاملہ میں کئی ایک ناانصافیاں مولانا کے ساتھ کی گئیں۔

(۱) قانون تحفظ ہند کے جرائم کی تحقیقات صرف لوکل گورنمنٹ کے مقرر کردہ کمشنر ہی کر سکتے ہیں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو اس بارہ میں مطلق کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

(۲) ملزم کو اسکی مرضی کے خلاف للت پور میں لایا گیا تو مقدمہ للت پور میں نہیں ہو سکتا تھا۔

(۳) جب لوکل گورنمنٹ کے ساتھ خط و کتابت جاری تھی اور حکم نظربندی کے خلاف ملزم کی عرضداشت لوکل گورنمنٹ کے زیر غور تھی تو اسپر عدول حکمی کا مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا تھا۔

اسکے علاوہ سب سے بڑی زیادتی اور ناانصافی یہ کی گئی کہ ملزم کو مقدمہ کی پیروی کرنے اور اپنی صفائی پیش کرنے کا مطلق موقع نہیں دیا گیا ظاہر ہے کہ ایسے دور افتادہ مقام پر جہاں نہ مولانا کا کوئی شناسا ہو اور نہ دوست ملاقاتی وہاں وہ چند گھنٹہ میں کیا کر سکتے تھے نہ بحث کے لئے کوئی وکیل یا اور نہ اتنی مہلت کہ مقدمہ کی کارروائی کو ترتیب دے کر جو غلط الزامات لگائے گئے تھے ان کی صفائی پیش کی جا سکے۔ گویا بالکل خود مختارانہ طریق سے یک طرفہ فیصلہ

کر دیا گیا۔

مولانا نے اس جابرانہ اور نا منصفانہ فیصلہ کی اپیل سیشن جج کی عدالت میں پیش کی مگر جہاں انتظامی اور عدالتی حکام میں کوئی فرق و تمیز نہ ہو اور انتظامی عمال کا دست دراز ہمیشہ کارفرما رہے وہاں ایسے معاملات میں انصاف پروری و معدلت شعاری کی توقع رکھنا ایک مضحکہ خیز امر ہے سیشن جج نے بھی اپیل نامنظور کر دیا۔ اسکے بعد مولانا نے ہائی کورٹ سے مرافعہ کرنے کی اجازت چاہی مگر یہ بھی مسترد کر دیگئی۔ اور درخواست نامنظور کر کے ہمیشہ کے لئے انصاف کا دروازہ بند کر دیا۔

اس مرتبہ مولانا کی نظر بندی اور جیلخانہ پر ملک و قوم کی طرف سے اس سرد مہری و بے نیازی کا اظہار نہیں کیا گیا جو ۱۹۱۶ء میں کیا گیا تھا۔ بلکہ اس کے خلاف مولانا کی صداقت پژوہی و حق گوئی اور ان کے اعلیٰ صفات و اخلاق سے دنیا اچھی طرح واقف ہو چکی تھی اور ان صفات عالیہ کی قدر و منزلت ... روشناس ہو گئی تھی یا یوں کہیئے کہ حسرت کے اصول حریت پرستی کو تمام باطل عقائد سیاسیہ پر کامل غلبہ اور فتح حاصل ہو چکی تھی اسلیئے گو جس ہیئت کا سزاوار مولانا کا معاملہ تھا اسکا اظہار نہیں کیا گیا تاہم ملک کے ہر ہر گوشہ سے مولانا کی بے قصور سزا وہی نظر بندی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی اور گورنمنٹ کو توجہ دلائی گئی خصوصاً ذیل کے مقامات پر کئی کئی بار جلسہ منعقد ہوئے اور ان میں گورنمنٹ کے حکم کے خلاف اظہار ناراضی کیا گیا۔ متھرا۔ فیض آباد۔ میرٹھ۔ حیدرآباد سندھ۔ دہلی۔ کلکتہ۔ سلطانپور۔ کھیری۔ لکھیم پور۔ کانپور۔ علی گڈھ۔ لکھنؤ۔ الٰہ آباد۔ بریلی۔ مرادآباد۔ آگرہ۔ ان مقامات پر تو متعدد بار جلسے ہوئے لیکن ان کے علاوہ بھی اکثر مقامات پر پرزور جلسہ ہوئے اور ان میں ملک کے ممتاز مقررین نے تقریریں کیں۔

علی ہذا صحافت وطنی نے بھی اپنی پوری قوت سے ان جابرانہ احکام کے خلاف صدائیں بلند کیں۔ اور نہ صرف اردو صحائف نے بلکہ انگریزی اخبارات میں بھی مضامین لکھے گئے۔ لیکن باوجود اسکے گورنمنٹ اپنی ضد پر قائم رہی۔ بلکہ روز بروز اور سختی اختیار کرتی گئی۔ مثلاً یہ کہ ان کو کسی ایک جگہ جیل میں بھی نہیں رہنے دیا گیا۔ بلکہ مختلف مقامات کے جیلخانوں میں ان کو چک پھیری پھروائی گئی۔ پہلے للت پور میں رکھا گیا تھا کیونکہ وہیں سزا دی گئی تھی۔ اسکے بعد بلاوجہ وہاں سے جھانسی تبدیل کر دیا گیا۔ اور جھانسی سے بھی الہ آباد جیل میں روانہ کر دیا گیا۔ الہ آباد میں تھوڑا ہی زمانہ گذرا تھا کہ پرتاب گڈھ بھیجدیا گیا۔ یہاں بھی خوف دامنگیر ہوا۔ کہ مبادا ایسے دست و پا حسرت کوئی آفت نہ ڈھائے۔ چنانچہ پرتاب گڈھ سے فیض آباد جیل میں آپ کو بھیجا گیا لیکن پھر بھی وہم نے ستایا تو لکھنؤ کے جیل کو مناسب سمجھا گیا۔ مگر بہت زمانہ نہ گذ..نے پایا تھا کہ حکام کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ آج کل لکھنؤ کی سرزمین سیاست کی رزمگاہ بنی ہوئی ہے اور یہاں حسرت کا رکھنا خوف و خطرہ سے خالی نہیں۔ چنانچہ لکھنؤ سے پھر فیض آباد جیل میں آپ کو واپس کیا گیا آخر میں فیض آباد سے میرٹھ جیل پر۔ اس جبریہ زندان نوردی کی مدت میعاد سزا اسکے ساتھ ختم ہوئی۔

اس زبردستی اور بلاوجہ کی چک پھیری کا نتیجہ غریب حسرت کے لئے یہ نکلا کہ انکی صحت جسمانی نہایت خراب ہوگئی۔ اور روز بروز خراب سے خراب تر ہوتی گئی اور چالیس پونڈ کے قریب ان کا وزن گھٹ گیا۔

خرابی صحت کی تمام تر ذمہ داری گورنمنٹ پر عائد ہوتی ہے کیونکہ اول تو جہاں کہیں بھی ان کو رکھا گیا وہاں کی آب و ہوا حسرت کے ناموافق ثابت ہوئی۔ اسکے علاوہ اگر کسی ایک ہی مقام پر ان کو رکھا جاتا تو شاید رفتہ رفتہ اس مقام سے

آب و ہوا کی طبیعت خوگر ہو جاتی مگر ایسا نہیں کیا گیا بلکہ جہاں دو چار مہینے ایک مقام پر گذرے اور طبیعت وہاں کی آب و ہوا سے مانوس ہونے لگی اور فوراً گورنمنٹ نے دوسرے مقام پر تبدیل کر دیا اور اس یکایک نئے اور غیر مانوس مقام پر جانے اور وہاں رہنے سے پھر صحت خراب ہو گئی۔ غرضیکہ اسی طرح تقریباً سارا زمانہ علالت و بیماری میں بسر ہوا۔

یوں تو عموماً ملک و قوم کی طرف سے گورنمنٹ کے اس طرز عمل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی۔ اور ریزولیوشن کی صورت میں گورنمنٹ سے خواہش کی گئی کہ کم از کم حسرت کو علی گڈھ جیل میں قیام کرنے کی اجازت دیجائے۔ مگر بخصوصیت کے ساتھ مولانا حسرت کی بیگم صاحبہ کو ان کی خرابی صحت کی وجہ سے زیادہ اضطراب رہا اور انہوں نے کوشش کی کہ حسرت کو علی گڈھ جیل میں رکھا جائے۔۔۔۔۔

۔۔۔۔ چنانچہ اس غرض کے لیئے بیگم صاحبہ محترمہ نے کوشش کی کہ وہ ہز آنر سر جیمس مسٹن سے ملاقات کریں۔ اور یہ عرضداشت پیش کریں۔ اس کام کے لیئے انہوں نے سید آل نبی وغیرہ کا توسط تلاش کیا مگر بیگم صاحبہ پھر بھی ہز آنر سے ملاقات نہیں کر سکیں۔ صرف سید آل نبی کے ذریعہ سے اپنی عرضداشت روانہ کی مگر اسکا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

مولانا حسرت کی خرابی صحت سے تمام ملک میں تشویش و اضطراب پھیل گیا۔ اور اخبارات نے آخر وقت تک گورنمنٹ کو توجہ دلائی کہ وہ اس طرز عمل کو کہ آج یہاں اور کل وہاں چھوڑ کر مولانا کو علی گڈھ میں رہنے کی اجازت عطا فرمائے۔ مگر سر جیمس مسٹن کی حکومت کو خدا معلوم حسرت کے وجود میں ایسی کیا مخفی قوتیں نظر آتی تھیں کہ علی گڈھ پہونچتے ہی زندان فرنگ کی زنجیروں اور بیڑیوں کے باوجود

ایک طوفان عظیم بر پا ہو جانے کا خوف ہمیشہ دامنگیر رہا اور شاید کچھ ایسی ہی وجوہ تھیں جن کی بنا پر حسرت کو علی گڑھ رہنے کی اجازت کسی طرح نہ دی گئی۔

مولانا حسرت پر ابتداءً کسی الزام کی تخصیص نہیں کی گئی تھی بلکہ عام نظر بندوں کی طرح وہی معمولی الفاظ کے ذریعہ حکم نظر بندی دیا گیا تھا لیکن بار بار کونسلوں میں سوالات کے بعد بالآخر گورنمنٹ نے مہر سکوت توڑی بھی تو عجیب بے بنیاد الزام ان پر لگا دیا یعنی یہ کہ وہ گورنمنٹ کے خلاف سخت ترین افعال کے مرتکب ہوئے ہیں یا ہونے والے تھے اس وجہ سے انکی نظر بندی عمل میں لائی گئی جس نے آخر میں سزائے جیل کی صورت اختیار کرلی۔

حسرت کے لیئے یہ کوئی خلاف توقع الزام نہ تھا اسلیئے کہ گورنمنٹ نے اکثر نظر بندوں کے متعلق جب پبلک کا اصرار و مطالبہ بہت بڑھ گیا اور ایجی ٹیشن ناقابل برداشت ہونے لگا تو اسنے یہی طرز عمل اختیار کیا ہے کہ کسی پر ترکوں سے غدارانہ خط و کتابت کا الزام لگا دیا جیسے مولانا ابو الکلام اور کسی پر ترکوں کے ساتھ اظہار ہمدردی کا الزام رکھدیا۔ جیسے مسٹر محمد علی و شوکت علی۔ حالانکہ ان تمام حضرات نے گورنمنٹ کو چیلنج دیا کہ اگر اس کے پاس ثبوت کافی ہے تو علانیہ کھلی عدالت میں ان پر مقدمہ چلائے لیکن جس الزام کی بنیاد محض شبہ پر اور صرف سی۔ آئی۔ ڈی کی جھوٹی رپورٹوں پر ہو ان کے خلاف عدالت میں کیونکر مقدمہ دائر کیا جا سکتا ہے۔

بہرحال کامل ایک سال کے بعد مولانا کی نسبت گورنمنٹ نے اپنا خیال ظاہر کیا کہ وہ کس وجہ سے نظر بند کئے گئے تھے لیکن صرف گورنمنٹ کا یہ کہدینا کہ فلاں شخص قابل اعتراض افعال کا مرتکب ہوا ہے پبلک کے لیئے تشفی بخش نہیں ہو سکتا جب تک کہ یہ نہ معلوم ہو کہ گورنمنٹ کے ذرائع معلومات درحقیقت قابل وثوق بھی ہیں کسی کو کیا معلوم کہ گورنمنٹ محض سی۔ آئی۔ ڈی کی رپورٹ پر حسرت کے معاملہ میں مطمئن

نہیں ہوئی۔ بلکہ اس سے زائد قابل اعتماد ذرائع سے اس نے معلومات حاصل کی ہو
اس اظہار الزام کے بعد قوم و ملک کی طرف سے پھر بھی بے اطمینانی کا اظہار
برابر ہوتا رہا اور تمام اسلامی ہند خصوصاً اور تمام متحدہ ہندوستان عموماً حسرت کو بے
قصور اور گورنمنٹ کے طرز عمل کو ناواجب و ناروا تصور کرتا رہا مگر وہ حکومت جو ایک
دفعہ پورا یقین دلانے کے بعد کہ اکثر نظر بندوں کے مسئلہ پر دوبارہ غور کیا جائیگا
اور ان کو رہا کر دیا جائے گا۔ پھر دوبارہ اپنی سخت گیر پالیسی پر پلٹ آئی ہو اور کسی
ایک نظر بند کو بھی آزادی نہ بخشی ہو۔ بھلا وہ غریب حسرت کے معاملہ پر کیا توجہ کرتی۔
حسرت کے متعلق تمام پبلک جلسوں کے ریزولیوشنوں اور اخبارات کے مضامین
جب بالکل بے اثر ثابت ہوئے تو آخر میں صوبجات متحدہ کی کونسل کے غیر سرکاری
ہندو مسلم آنریبل ممبران نے ایک متفقہ اور متحدہ میموریل سر جیمس مسٹن کی خدمت میں روانہ
کیا۔۔۔ اس میموریل میں صوبہ متحدہ کے تمام غیر سرکاری ممبران کونسل کے دستخط
ثبت تھے اور اسمیں مولانا حسرت کے معاملہ پر رحم آمیز طریقہ سے دوبارہ توجہ
کرنے کی گورنمنٹ سے درخواست کی گئی تھی۔ لیکن اسکا حشر یہ ہوا کہ پہلے تو تین چار
ماہ تک اس میموریل پر کوئی توجہ ہی نہیں کی گئی حالانکہ تمام اخبارات میں اسکا ذکر برابر
ہوتا رہا اور گورنمنٹ کو یاددہانی بھی کی گئی۔ چنانچہ جب کئی ماہ تک اس میموریل کے
متعلق گورنمنٹ کا کوئی منشا معلوم نہ ہوا تو آخر مجبور ہو کر آنریبل مسٹر چینتامنی
نے حسب ذیل سوال پیش کیا:۔

"کیا گورنمنٹ کو با اثر اصحاب کا دستخط شدہ ایک میموریل موصول ہوا
ہے جس میں ہز آنر سے مسٹر فضل الحسن حسرت موہانی کے معاملہ میں
رحم آمیز طریقہ سے غور کرنے کی التجا کی گئی ہے"
"کیا گورنمنٹ مہربانی سے بتلائے گی کہ ہز آنر نے ازراہ کرم اس میموریل پر

کیا حکم صادر کیا ؟ "

اسی اجلاس کونسل میں آنریبل پنڈت گوکرن ناتھ مصر نے بھی دو سوالات مولانا حسرت موہانی کے معاملہ کی نسبت کئے تھے مگر ان کا نمبر آنریبل مسٹر چینتامنی کے سوال کے بعد رکھا گیا تھا۔ پنڈت صاحب کا پہلا سوال تو میموریل ہی کے فیصلہ کی بابت تھا مگر دوسرا سوال موصوف نے ایک مفید اظہار خیال کی صورت میں ترتیب دے کر پیش کیا تھا پنڈت صاحب موصوف نے گورنمنٹ سے دریافت کیا تھا کہ :-

"اگر حکومت کسی نزدیک وجوہ کے باعث ان بندشوں کا ہٹانا ناپسندیدہ ہو
جو سید فضل الحسن حسرت موہانی پر ازروئے قانون تحفظ ہند عائد کی گئی ہیں
تو کیا گورنمنٹ برائے مہربانی سید فضل الحسن کو جیلخانہ سے رہا کر کے انہیں
اپنے مکان واقع علی گڈھ میں ایسی بندشوں کے ساتھ رہنے کی
اجازت دیگی جو ضروری سمجھی جائیں "

ان سوالات کا نتیجہ سمجھئے یا کچھ اور بہرحال اس میموریل کی رسید گورنمنٹ کی طرف سے حسب ذیل الفاظ میں آنریبل پنڈت جگت نرائن صاحب کے پاس جنکے توسط سے میموریل بھیجا گیا تھا موصول ہوئی ۔ یہ رسید گورنمنٹ صوبجات متحدہ کے چیف سکرٹری کی معرفت یا ان کی روانگی ہوئی آئی تھی جو ذیل میں درج ہے :-

"مجھے ہدایت کی گئی ہے کہ میں یہ تحریر کروں کہ باشندگان صوبجات متحدہ
کا وہ میموریل موصول ہوا جس میں یہ استدعا کی گئی ہے کہ سید فضل الحسن
حسرت موہانی جیل سے رہا کئے جائیں زیر قانون تحفظ ہند جو پابندیاں
قائم کی گئی ہیں وہ ہٹا دی جائیں میموریل پر وہ توجہ ہوگی جس کا اسکی
وزنی حمایت اسکو مستحق بناتی ہے لیکن جناب لاٹ صاحب بہادر
یہ امید نہیں دلاسکتے کہ سید فضل الحسن حسرت موہانی پر جو پابندی زیر قانون

تحفظ ہند قائم کی گئی تھیں وہ ہٹا دی جائینگی۔

سید فضل الحسن حسرت موہانی کی سیاسی ایجی ٹیشن کے باعث ان پابندیوں میں نہیں رکھے گئے بلکہ سرکار کے خلاف نہایت سنگین قسم کے افعال ان سے سرزد ہونے کے باعث یہ پابندیاں ان پر ہوئی ہیں اور بدیں وجہ ان کے حق میں ان قیود کا سلسلہ ضرور جاری رہنا چاہیئے۔"

جس الزام کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں اس کا علم پہلی مرتبہ اس تحریر کے ذریعہ ہوا تھا۔ لیکن باوجود اس سخت و سنگین الزام کے قائم کر دینے کے پھر بھی حکومت نے امید دلائی تھی کہ میموریل کی وزنی حمایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسیر غور و توجہ کیجائیگی۔ گورنمنٹ کے جواب سے تمام ملک میں کم از کم اس امر کا اطمینان ہو گیا تھا کہ اب مولانا حسرت کو بجائے جیل میں رکھنے کے علی گڈھ میں رہنے کی اجازت دیجائے گی گو قیود نظر بندی ان پر سے نہ ہٹائی جا سکیں۔

آنریبل پنڈت گوکرن ناتھ صاحب مصر نے جو سوال کیا تھا اس سے بھی اس خیال کو تقویت حاصل ہوئی تھی کہ گورنمنٹ کم از کم اس سوال میں جو مقصد ظاہر کیا گیا ہے اسکو ضرور پورا کر دیگی۔ اگرچہ یہ کچھ ایسی زیادہ رعایت نہ ہوتی جس کیلئے گورنمنٹ کے آگے درخواست ترحم پیش کی گئی تھی مگر ایسی حالت میں کہ مولانا کی صحت روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی اور ان کا وزن دن بدن گھٹتا جاتا تھا اسی کو غنیمت سمجھا گیا تھا کہ علی گڈھ میں قیام کرنے کی اجازت مل جائے گی۔

اب اس درخواست کو آئے اور شائع ہوئے بھی خاصا زمانہ گذر گیا اور مسٹر مسٹن کے دور حکومت کے خاتمہ کا وقت بھی قریب آ گیا مگر ہنوز اس وزنی حمایت والے "میموریل کا کوئی نتیجہ ظہور پذیر نہوا جس زمانہ میں سر جیمس مسٹن کو الوداعی عرضیں دی جا رہی تھیں اور آپ با حسرت ان جوابی الوداعی تقریریں فرما رہے تھے عین

اسی زمانہ میں اخبارات پھر توجہ دلانے لگے کہ کم از کم اپنے عہد آخرین کے یادگار کے طور پر تو ہز آنر مولانا حسرت کے معاملہ کو بھی سوچ لئے جائیں۔

ہندوستان سرحسین سلطان کی چشم التفات کی گردش کا بہت اضطراب و بے چینی کے ساتھ انتظار کر رہا تھا کہ یکایک پیشگاہ حکومت سے ایک خبر شائع ہوئی کہ حکومت چند شرائط پر مولانا حسرت کو آزاد کرنے پر رضامند تھی مگر انہوں نے آزادی حاصل کرنے سے انکار کر دیا۔

یہ خبر ایسی نہ تھی کہ تمام اسلامی ہند کو خصوصًا اور تمام متحدہ ہندوستان کو عمومًا محو حیرت و استعجاب نہ کر دے لیکن ابھی بہت زمانہ نہ گذرا تھا کہ وہ ہی ایک روز کے بعد بیگم صاحبہ حسرت موہانی نے اس طلسم حیرت و استعجاب کو اپنی ایک تحریر سے توڑ کر رکھدیا۔ بیگم صاحبہ کی تحریر سے معلوم ہوا کہ جسکو آزادی کی بہشت زار بتلایا گیا تھا اس میں اور زندان میرٹھ کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں کوئی فرق نہ تھا۔

محترمہ بیگم صاحبہ نے حسب ذیل تحریر پریس میں روانہ کی تھی:۔

"۲۰ر فروری کو ۱۲ بجے دن کے سپرنٹنڈنٹ پولیس میرٹھ ایک اور یورپین افسر کے ساتھ مولانا حسرت کے پاس جیل میں آئے اور حسرت سے کہا کہ گورنمنٹ تم کو رہا کرنا چاہتی ہے مگر اس شرط پر کہ کلکٹر ضلع میرٹھ کے بنگلہ میں جو لب سڑک ہے نظربندی کی چند قیود کے ساتھ رہنا منظور کر و۔"

"ان قیود کی ایک نقل بھی حسرت کو دی گئی جو بھی ہمراہ لائے تھے مگر حسرت نے اسے منظور نہیں کیا اور انگریزی میں ایک تحریر لکھ کر واپس کر دی۔ غالبًا حسرت کی تحریر گورنمنٹ کو روانہ کر دی گئی۔ دیکھئے کیا نتیجہ نکلتا ہے"

خیر جو کچھ بھی ہو حسرت نے اپنا معاملہ خدا کے سپرد کر دیا ہے حسرت نے جو طرز عمل اختیار کیا ہے اسے ضد اور خود رائی کو مطلق دخل نہیں ہے۔ بقول حافظ ؏

بارہا گفتہ ام و بار دیگر میگویم
کہ من دل شدہ این رہ نہ بخود میپویم

میں نے حسرت کی اس کارروائی کو بعید اطمینان اور خوشی کے ساتھ دیکھا نظر بندی سے قید ہر حال میں بہتر ہے۔ حسرت نے خوب کیا مجھے ان سے ایسی ہی امید تھی۔

مولانا حسرت نے گورنمنٹ کے مقید و مشروط حکم نامہ پر جو تحریر لکھ کر واپس کر دیا تھا۔ اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:۔

"میں اب بھی اپنے اس اعلان پر ثابت قدم ہوں جو میں نے سنہ ۱۶ء میں کیا تھا اب بھی میرا ایمان اور میرا ضمیر مجھے اسکی اجازت نہیں دیتا کہ میں کسی ایسے حکم کی تعمیل کروں جو قانون تحفظ ہند کے ماتحت دیا گیا ہو۔ اور جس کے ذریعہ سے مجھے ایک ایسے جرم کی سزا دیجاتی ہو جسکا نہ پہلے سے مجھے کچھ علم ہے نہ کوئی نوعیت معلوم ہے نہ جسکا ارتکاب اپنے علم و یقین میں میں نے کیا ہے۔ پھر یہ سزا اس طرح دیجاتی ہو کہ مجھے اپنی صفائی یا تردید کا بھی موقع نہ دیا جائے۔ البتہ میں اتنا اضافہ کرسکتا ہوں کہ اگر بغیر کسی شرط کے آزادی دیجائے تو میں بطور خود اس بات کا وعدہ کرنے کو تیار ہوں کہ حکام کے وہم و شکوک کو رفع کرنے کے لیئے کم و بیش گورنمنٹ کے مصالح کا خیال رکھوں گا"

بیگم صاحبہ حسرت موہانی اور خود مولانا کی تحریر سے آپ صرف اس قدر اندازہ کرسکے ہوں گے کہ مولانا نے کشور میں رہنے سے جیل میں رہنے کو ترجیح دی اور یہ کہ مولانا ہنوز احکام نظر بندی کو ناجائز سمجھتے ہیں۔ لیکن "وزنی حمایت والے "میموریل پر ہمدردانہ غور و توجہ کا جو وعدہ کیا گیا تھا جسکا ذکر چیف سکرٹری صاحب نے اپنی

رسید میں کیا تھا۔ اس موعودہ غور و توجہ کی پوری حقیقت اسوقت منکشف ہوگی جب
آپکے سامنے وہ شرائط بھی آجائیں جو اس نام نہاد چند روزہ آزادی کے بالمقابل
گورنمنٹ نے تجویز کی تھیں۔

اگرچہ حکم نامہ کے ساتھ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے مولانا حسرت کو شروط و قیود
کی وہ طویل و عریض فہرست بھی مرحمت فرمائی تھی جنکی پابندی کے بغیر آزادی نہیں
مل سکتی تھی۔ مگر شاید مولانا نے وہ شرطیں بیگم صاحب کو نہیں بھیجی تھیں۔ یا سنسر نے
روک لی تھیں۔ بہرحال کئی روز تک کیا بلکہ کئی ہفتہ تک اسکا علم پبلک کو نہیں ہوسکا
اور جو سرکاری کمیونک شائع کی گئی تھی اسمیں صرف یہ ظاہر کیا گیا تہا کہ حکومت چند
شرطوں کے ساتھ حسرت کی بقیہ میعاد قید کو معاف کرنے کے لیئے تیار تھی مگر انہوں
نے منظور نہیں کیا۔

جب شرائط کی اشاعت میں زیادہ تعویق ہوئی تو بالآخر مسٹر چیتامنی نے کونسل
میں سوال کیا کہ براہ مہربانی وہ شرطیں بتلائی جائیں لیکن اسپر بھی وہ شرطیں نہیں بتلائی
گئیں لیکن پھر بعد میں ایک اور سوال کے جواب میں آخر کار حکومت کو وہ شرطیں ظاہر
کرنی پڑیں جو حسب ذیل ہیں:۔

(۱) تم کو تا صدور حکم ثانی قصبہ کھٹور ضلع میرٹھ کی حدود میں کسی ایسے مکان میں
جو مجسٹریٹ ضلع منظور کرے ٹھہرنا ہوگا۔

(۲) تم کو مجسٹریٹ ضلع یا اوسکی جانب سے کسی حاکم با اختیار کی تحریری
اجازت لیئے بغیر مذکورہ حدود کے چھوڑنے کی اجازت نہیں۔

(۳) تم کو روزانہ ذاتی طور پر ۱۰ اور ۵ بجے کے درمیان بجز بیماری یا انتہائی
ضعف کے جسکی تمہیں افسر متعلقہ کو فوراً خبر کردینی چاہیے افسر انچارج تھانہ کھٹور کو اپنی
موجودگی کی رپورٹ کرنی ہوگی۔

(۴) تم کو اسکی ممانعت ہے کہ کسی ملاقاتی کو ان آخری حدود تک جن میں رہنے کی تم سے خواہش کی گئی ہے سورج نکلنے اور ڈوبنے کے درمیان لینے یا رخصت کرنے کے لیے جاؤ۔

(۵) تمہیں پولیس افسر انچارج کو ان سب لوگوں کے نام بتانے ہوں گے جو تمہاری فرودگاہ پر آئیں۔ بجز باشندگان قصبہ مذکور اور ان لوگوں کے نام بھی بتانے ہوں گے جن کو تم خط کے علاوہ کسی اور طریقہ سے پیغام بھیجو یا خطوط۔ اگر تم کو جبکہ پیام تمہیں (خط کے علاوہ کسی اور طریقہ سے) ملیں اگر یہ پیام کسی شخص کے ذریعہ سے ملیں تو اس شخص کی تمہاری اقامتگاہ سے رخصت ہونے یا تمہارے پیام بھیجنے یا وصول کرنے سے تین گھنٹہ پیشتر تم کو اطلاع دینی چاہیئے۔

(۶) تم سارے تار یا شاید ڈاک یا دستی خطوط کے جواب جو تمہارے پتہ پر آئیں بلا توقف اور بغیر کھولے ہوئے پولیس افسر مذکور کے پاس بھیجو گے۔ تم کو کسی شخص کے ساتھ اسوقت تک تحریری مراسلت رکھنے کی بھی اجازت نہ ہوگی جب تک افسر مذکور اس خط و کتابت کی جانچ نہ کر لے۔

(۷) تم اس مکان میں جہاں رہنے کی تم سے خواہش کی گئی ہے وہاں کے افسر انچارج تھانہ مذکور یا مجسٹریٹ ضلع یا کسی افسر کو جو درجہ میں پولیس افسر انچارج تھانہ یا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے بالا ہو تمام اوقات میں آزادی سے آنے جانے دو گے۔

یہ ہیں وہ شرطیں جن کی بنا پر بیگم صاحب حسرت موہانی نے اپنی تحریر میں لکھا ہے کہ نظر بندی سے قید ہر حال میں اچھی ہے۔

مگر ذرا چشم عبرت و تامل سے آغاز میموریل سے اسوقت تک کے واقعات و حالات دیکھے جائیں تو اسوقت آپ اندازہ کر سکیں گے کہ وہ وزنی حمایت والی میموریل پر سپرد وانہ توجہ جس کا وعدہ کیا گیا تھا کس عجیب عنوان کے ساتھ مولانا کے حال پر

کی گئی۔

ایک ایسا میموریل جسپر صوبہ کے تمام با اثر اصحاب یعنی کونسل کے تمام غیر سرکاری آنریبل ممبران کے دستخط ہوں اور جس میموریل کے وزنی ہونے کا خود گورنمنٹ کو اعتراف ہو اور جسکی رسید میں یہ ظاہر کر دیا گیا ہو کہ میموریل اپنی وزنی حمایت کے لحاظ سے جس غور و توجہ کا مستحق ہے وہ اسپر کی جائے گی۔ اور پھر اس میموریل جانے کے بعد مختلف آنریبل ممبران نے جو عاجزانہ سوالات کئے تھے نیز ملک و قوم اور خود بیگم صاحب حسرت موہانی کے مطالبات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر شخص بآسانی اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ کم از کم حکومت حسرت کو علی گڈھ میں اپنے مکان پر نظر بندی کی قیود کے ساتھ رہنے کی اجازت دے گی اور آنریبل پنڈت گوکرن ناتھ مصر میموریل کی رسید موصول ہونے کے بعد اپنے ایک سوال میں ملک و قوم کی کم سے کم خواہش کو گورنمنٹ پر ظاہر کر چکے تھے کہ حسرت کو مناسب قیود کے ساتھ علی گڈھ میں رہنے کی اجازت دیجائے لیکن ان تمام التجاؤں عاجزیوں منت اور خوشامد طرازیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ اول تو میموریل پر اس قدر غور و فکر کیا گیا کہ کئی ماہ اس میں گذر گئے اور جب غریب حسرت کی میعاد قید ختم ہونے کے بالکل قریب آگئی۔ یعنی بمشکل دو ڈھائی مہینہ باقی رہ گئے اسوقت ہمدردانہ غور و توجہ کے یہ نتائج نکلے کہ کوئی خوددار آدمی اسکو منظور نہیں کر سکتا۔ موجودہ شرائط کے ساتھ کسی دوسرے مقام اور جیل میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا بلکہ ایسی سخت شرائط پر ہر شخص جیل ہی کو ترجیح دے گا۔

خصوصاً مولانا حسرت جیسا ضمیر و ایمان پرست انسان جو پہلے ہی سے اس قانون اور اسکی پابندی کو ناجائز سمجھتا ہو۔ وہ بھلا کیونکر گورنمنٹ کے ایسے فیصلہ کو تسلیم کر سکتا ہے جسمیں ذرہ برابر سابقہ حالات سے تجاوز نہ کیا گیا ہو اور قصداً مولانا کی طبیعت کو ملحوظ رکھ کر ایسے احکام صادر کئے گئے ہوں جن کو وہ تسلیم کرنیسے

بالکل معذور رہوں۔

کہا جاتا ہے کہ انگریزی قوم کبھی دبتی نہیں ہے جس قدر اسکو مجبور کیا جاتا ہے اسی قدر اسکا عزم و استقلال بڑھتا ہے لیکن اسکے خلاف حسن طلب اور صلح و آشتی کے مقابلہ میں انگریز نرم ہوجاتے ہیں اور معاملات کو رفق و لینت کے ساتھ طے کرنے کے لیئے طیار ہوجاتے ہیں لیکن مولانا حسرت کے معاملہ میں شروع سے آخر تک تمام واقعات پر غور کر جایئے آپ کو کہیں بھی متانت و سنجیدگی کے خلاف یا حکومت کے ادب و احترام کے مخالف کوئی بات نظر نہ آئے گی لیکن باوجود اسکے حسرت کے معاملہ میں انگریزی کیرکٹر کی وہ خوبی آپ کو کہیں بھی نظر نہ آئے گی جس کے وہ مدعی ہیں۔

مولانا حسرت کے متعلق گورنمنٹ نے جو طرز عمل اختیار کیا گو وہ غیر متوقع نہ ہو لیکن واقعات کا استقرار کرنے سے مزید بدظنی و بدعقیدگی کی اسپرٹ پیدا ہونے کا احتمال ہے کیونکہ انکے احکام میں یہ بات نمایاں نظر آتی ہے کہ قصداً ایسا طرز عمل اختیار کیا جائے جس سے حسرت اپنے ضمیر و ایمان کے فیصلہ کو محفوظ رکھ کر مستفید نہ ہو سکیں۔

انعام نہاد عطائے حریت و بخشش آزادی کو جس طرح بے نیازانہ اندازسے مولانا حسرت نے عطائے تو بہ لقائے تو کہہ کر واپس کیا اور حکم حاکم کے جواب میں جو تحریر حسرت نے لکھی ہے وہ صرف حسرت ہی کا حصہ تھا اور وہ ان کی عدیم المثال قوت ایمانی اور لازوال اعتماد علی اللہ کی ایک کھلی ہوئی نشانی ہے وہ لوگ جن کے قلوب و ارواح ذوق ایمان کی شیرینی سے محروم ہیں اور ذرا سی نگاہ کرم پر کتوں کی طرح پاؤں پر لوٹنے لگتے یا چشم عتاب آلود کی ایک ہی گردش میں صبر و ثبات عزم و ارادہ اور ایمان و ضمیر کو قربان کرنے کے لیئے تیار ہوجاتے ہیں۔ ان کو مولانا حسرت اور انکی مقدس تحریروں سے درس عبرت حاصل کرنا چاہیئے۔ یہی وہ مقام ابتلا و آزمائش ہے

جہاں کھوٹی اور کھری چیزیں الگ الگ ہو جاتی ہیں اور خلوص و للّٰہیت اور نمود و نمائش دو جداگانہ حقیقتوں میں منقسم ہو جایا کرتی ہیں۔

بہرحال گورنمنٹ کی عنایت و نوازش کا جو دریا اُمڈا تھا اوسکی موجوں کا شور بلند ہوا اور بلند ہو کر رہ گیا۔ جو تشنہ کام تھے وہ اب بھی ویسے ہی العطش العطش کے فریادی ہیں۔

اسوقت تو مولانا حسرت اپنے پیشواؤں کی طرح فاقض ما انت قاض انما تقضی ھٰذہ الحیاۃ الدنیا کی بشارت سے اطمینان قلب حاصل کر سکتے ہیں مگر کل اسکے عواقب و انجام سے کوئی وجود اپنے کو محفوظ نہیں رکھ سکتا۔

۲۰ر فروری کو بخشش آزادی کا فرمان پیشگاہ حکومت سے صادر ہوا تھا اور ۲۲ر مئی کو میعاد قید ختم ہونے والی تھی یعنی کل تین ماہ کی قلیل مدت کے لئے یہ طوفان رحمت و رافت برپا ہوا تھا مگر ایک حقیر ذرہ کی خشکی کو سیرابی و تری سے تبدیل کیئے بغیر جہاں سے یہ فتنہ اٹھا تھا پھر وہیں آ کر ختم ہو گیا۔ تین ماہ کی مدت گو حکومت کے نزدیک بہت طویل ہو جس کو ختم کرانے کے لیئے اسنے اپنے جذبۂ رحم کو حرکت دی تھی تاہم بلاکشان راہ حریت و آزادی کے نزدیک یہ مدت زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ چنانچہ بحمد اللہ کہ حسرت نے نہایت صبر و سکون کے ساتھ اس زمانہ کو بھی طے کر دیا۔

۲۲ر مئی کی تاریخ اگرچہ آزادی و رہائی کا دن تھا مگر یوم مسرت و خوشی نہ تھا بلکہ ایک نیا مرحلہ امتحان و آزمائش تھا یعنی دو سال کی مسلسل قید کے بعد پھر از سر نو وہی منزل امتحان اور وہی محل آزمائش درپیش تھا۔ یعنی جس وجہ سے آج سے دو سال قبل حسرت نے قانون تحفظ ہند کے احکام کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا وہی وجہ آج بھی موجود تھی اور ایمانی قوت و ضمیری فیصلہ میں آج بھی وہ

سال کی متواتر مصیبتوں اور کلفتوں کے برداشت کرنے کے بعد بھی کوئی ضعف و تنزلزل واقع نہیں ہوا تھا۔ ایک طرف حکومت کی ضد اور زبردستی اپنی انتہائی طاقت کی نمایش کر رہی تھی اور دوسری طرف ایمان و ضمیر کی حق پرستی و حق شعاری اس کے مقابلہ کے لیئے طیار تھی۔

حسرت کے قدردان مضطرب و پیشان تھے کہ کہیں یہ شہنشاہ اقلیم حریت و ایمان پرستی پھر جیل کی پرصعوبت چاردیواری کے اندر مقید نہ کر دیا جائے کیونکہ ایمانی کاروبار اور حق پرست ضمیر کے فیصلہ انسانی خودرائی و ضد کے مقابلہ میں کبھی زبون و خوار اور مغلوب و سرنگوں نہیں ہوا کرتے۔ دوسری طرف استبداد و جبر اپنی اعادہ قوت و طاقت کے لیئے بالکل آمادہ نظر آتی تھی یعنی اپنے ۱۶ء کے فیصلہ نامنصفانہ کی یاد کو پھر ایک دفعہ ۲۲ر مئی ۱۸ء کو زندہ کرنیکے لیے تیار تھی۔

غرضکہ حق و باطل استبداد و حریت خودرائی و ضمیر پرستی کا ایک معرکہ تھا جو بظاہر ضعیف و ناتوان اور کمزور و بے سروسامان حسرت اور طاقت ور و مغرور حکومت کے درمیان درپیش تھا شاید بعض کمزور ہستیاں اور وہ لوگ جنکو ایمان و ضمیر کی دولت نہیں ملی یا بہت کم ملی ہے۔ وہ اس امر کے متوقع ہوں کہ اب دو سال کی سزائے قید کے مصائب و آلام برداشت کرنے کے بعد حکومت کی دانستہ یا نادانستہ ضد او خودرائی کے مقابلہ میں حسرت اپنی سپر ڈالدیں گے مگر وہ لوگ جو لذت ایمان سے محروم اور قوت ضمیر کی نیرنگ سازیوں سے نا آشنا ہیں وہ حسرت کے عزم و استقلال کا اندازہ کیونکر لگا سکتے ہیں۔

بہرحال وہ آنیوالی تاریخ آئی۔ اور حسرت نے اس معرکہ حق و باطل میں وہی کیا جسکی ان سے توقع تھی۔ حکومت نے ان کی میعاد سزا ختم ہونے پر ان کو رہائی دی اور ساتھ ہی احکام نظربندی بھی دینے چاہے مگر حسرت نے ان کو لینے سے یکقلم انکار کر دیا۔

اسموقعہ پر بیگم صاحبہ حسرت موہانی اور سنٹرل بیورو کے کارکن مسٹر تاج الدین احمد نواب

اسحاق خان صاحب قبلہ پہلے سے میرٹھ پہونچ گئے تھے۔ نواب صاحب قبلہ نے اس موقع پر بہت کچھ رفاقت کی اور مولانا حسرت کو چند روز کے لیئے اس امر پر آمادہ کر لیا کہ وہ بطور خود کھٹولی میں قیام کر لیں تاکہ اس عرصہ میں حکومت سے مزید گفتگو کی جا سکے۔

چنانچہ مولانا نے اپنی خوشی سے بطور خود چند روز کے واسطے کھٹولی میں رہنا منظور فرما لیا۔ اور ایک تار گورنمنٹ کو دیا گیا کہ اگر حکومت نظر بندی کے احکام کا نوٹس جاری نہ کرے تو وہ اپنی خوشی سے کم و بیش حکومت کی شرطوں کا خیال کریں گے۔ یہی اسوقت بھی حسرت نے کہا تھا جبکہ فرمان آزادی آج سے تین ماہ قبل صادر ہوا تھا مگر اسدفعہ حکومت نے حسرت کی اس شرط کو منظور کر کے جاری شدہ احکامات نظر بندی کو اٹھا لیا اور نوٹس کو منسوخ کر دیا۔

اسکے بعد قاضی بشیر الدین صاحب مشیر قانونی اور آنریبل سید آل نبی کی معرفت ایک میموریل گورنمنٹ کی خدمت میں نینی تال روانہ کیا گیا اسمیں گورنمنٹ سے خواہش کی گئی تھی کہ ان کو علی گڈھ میں رہنے کی اجازت دیجائے مگر حکومت نے اسکو منظور نہیں کیا۔ لیکن بجائے کھٹولی کے میرٹھ میں رہنے کی اجازت دیدی تھی لیکن سعی و کوشش کا سلسلہ جاری رہا۔ ادھر تو عالیجناب نواب اسحاق خان صاحب گورنمنٹ کے پاس ایک وفد لیجانے کی فکر کر رہے تھے اور ادھر اس نازک موقع کے لیئے پہلے ہی ہندوستان کے مشہور و ممتاز قوم پرست وکلاء اور بیرسٹروں کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کی گئی تھی جس میں بفضلہ بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔ اور پیروی مقدمہ کی تیاریاں تقریباً مکمل ہو گئی تھیں لیکن گورنمنٹ سے جو گفت و شنید جاری تھی اسکا بالآخر یہ نتیجہ نکلا کہ مولانا کو وہاں میں رہنے کی اجازت دیگئی۔ اور حکومت نے احکام نظر بندی کے جاری کرنے سے احتراز کیا۔ مگر مولانا ممدوح اصرار فرماتے رہے کہ ان کو دو چار دن کے لیئے علیگڈہ جانے کی اجازت بھی دیجائے گورنمنٹ اس خواہش کے پورا کرنے پر کسیطرح آمادہ نہ تھی اور شاید یہ " راج ہٹ " پھر معاملات کو پیچیدہ

کر دیتی مگر آخر میل مرزا اسمٰع اللہ بیگ صاحب کی کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ آخر حکومت نے مولانا حسرت کو دو چار دن کے لیئے علی گڈھ جانے کی اجازت دیدی۔ اس طرح بہت سی خرابیوں کے بعد آخر مولانا کے لیئے یک گونہ سکون و اطمینان کی راہ کھل سکی لیکن کوئی نہیں کہہ سکتا کہ حکومت نے اس تمام کشمکش میں ایک لمحہ کے لیئے بھی انصاف اور عدالت کا کوئی دلپذیر نمونہ پیش کیا ہو ادھر ضد تھی ادھر قوت ایمانی بہرحال اس عہد ابتلا و مصائب میں ان لوگوں کیلیئے جنکے دل مولانا کے مصائب پر خون ہورہے تھے یہ جو کچھ ہوا یہ بھی غنیمت ہے

رہائی کے وقت منجانب پولیس جو اہتمامات کئے گئے تھے ان کا معلوم کرنا بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ حکومت کے نزدیک حسرت کا وجود اس قدر خطرناک سمجھا گیا تھا کہ جیل کے گرد و پیش تمام سڑکوں اور ناکوں پر پولیس کا باقاعدہ پہرا قائم کردیا گیا تھا تاکہ کوئی پرندہ پر تک نہ مار سکے ہمدم اور جمہور کے نامہ نگاروں نے لکھا ہے کہ مسلح پولیس کا اس قدر شاندار انتظام کیا گیا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ گویا وائسرائے یا کوئی ایسا ہی افسر اعلیٰ اس طرف سے گذرنے والا تھا۔ اس ناکہ بندی اور پہرہ چوکی کا یہ اثر ہوا کہ میرٹھ کی کمزور طبیعت مخلوق سہم کر رہ گئی۔ اور کسی کو یہ جرأت نہ ہوسکی کہ وہ حسرت کے استقبال و پذیرائی کے لیئے آگے بڑھتا۔

خدا معلوم حسرت کے وجود کے اندر وہ ایسی کیا خوفناک قوت برق موجود تھی جو ان سے نکل کر قرمن امن و امان کو نذر آتش کردیتی حکام میرٹھ کی یہ سختی سخت قابل اعتراض تھی کہ مسلمانوں کو اپنے ایک واجب الاحترام لیڈر کے استقبال و زیارت سے ان کو محروم کردیا +

موجودہ اسیری کے متعلق متفرق واقعات

اس نظر بندی و اسیری میں ابتداً جو سختیاں ناانصافیاں اور زبردستیاں حسرت کے

ساتھ کی گئیں ہیں ان کا ذکر ہم تھوڑا بہت اوپر کر چکے ہیں لیکن ابھی وہ سختیاں جو جیل کے اندر ان کے ساتھ یا ان سے متعلق دوسروں کے ساتھ کی گئی ہیں وہ باقی ہیں۔

ہندوستان میں پولٹیکل محبوسین کے ساتھ جیسا توہین آمیز اور اعزاز نفس و احترام ذاتی کے منافی سلوک و برتاؤ کیا جاتا ہے وہ بجائے خود نہایت قابل نفرت و حقارت ہے اور موجودہ حکمران و مدبرین کے عہد میں ہندوستان کے لئے مخصوص ہے لیکن حسرت کے ساتھ جو غیر منصفانہ سختیاں کی گئی ہیں وہ ہندوستان کے اندر بھی آپ اپنی مثال ہیں۔ چنانچہ اس قسم کے ناجائز و ذلت آمیز طرز عمل سے مجبور ہو کر مولانا کو ایک دفعہ بطور پروٹیسٹ اور صدائے احتجاج کے الہ آباد جیل میں چار روز کھانا وغیرہ ترک کرنا پڑا تھا بالآخر جب کئی وقت بغیر کھائے پئے گزر گئے تو مجسٹریٹ ضلع کو مجبوراً مولانا کا مطالبہ پورا کرنا پڑا۔ اور جس تکلیف میں ان کو مبتلا کر دیا گیا تھا اس سے نجات ملی۔

مہذب دنیا میں پولٹیکل قیدیوں کو تمام قیدیوں سے ممتاز رکھا جاتا ہے اور ان کے ساتھ نسبتاً بہتر سلوک کیا جاتا ہے۔ مگر یہاں مطلق اس بات کا پاس و لحاظ نہیں کیا جاتا۔ بلکہ حکام کو ان سے اور زیادہ بغض و عناد ہوتا ہے اور نسبتاً زیادہ سختی کی جاتی ہے۔ چنانچہ عام قیدیوں سے ہفتہ میں ایک مرتبہ ان کے اعزا و احباب مل سکتے ہیں لیکن حسرت کے ساتھ اس قدر سختی برتی گئی کہ اس دو سال کی طویل مدت میں بہت کم لوگوں کو موقع دیا گیا کہ ان سے مل سکیں اور انکی تکلیف و آرام کے متعلق کچھ معلومات حاصل کر سکیں۔ یہاں تک کہ جو لوگ ان سے ملنے یا ان کو کسی اپنی طریقہ سے مدد پہونچانے کی غرض سے ان کے پاس گئے۔ ان کے ساتھ بھی پولیس افسران اور مقامی حکام نہایت ذلت آفرین اور قابل نفرت و حقارت طریقہ سے پیش آئے بلکہ ان پر ناجائز دباؤ ڈال کر ان کو طرح طرح

دھمکیاں دے دیکر مولانا کی اعانت و امداد سے باز رکھنا چاہا۔ ذیل میں اس بیان کے ثبوت کے طور پر ہم ایک طبعی بر واقعہ مراسلت درج کرتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مولانا حسرت کے ساتھ بعض مقامی حکام کیا تعاقب و جوش اور معاندانہ جذبہ اپنے اندر مخفی رکھتے ہیں۔ یہ مراسلت سید افضال حسین صاحب رضوی وکیل ہردوئی ضلع بارہ بنکی نے ۵ ؍ اگست ۱۶ء کے اخبار نئی روشنی الہ آباد میں شائع کرائی تھی۔ موصوف مولانا حسرت کے مقدمہ اپیل کی پیروی کے لیے جھانسی تشریف لے گئے تھے۔ اور وہاں جو واقعات پیش آئے ان کا اظہار اس مراسلت میں آپ نے کیا ہے :۔

مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی کی مظلومی اور درد اسلامی سے متاثر ہو کر میں نے پیروی اپیل کا ارادہ کیا۔ چنانچہ اپنے وطن ہردوئی سے سوار ہو کر ۱۸ ؍ جون ۱۶ء کی شام کو قریب ۵ بجے میل ٹرین سے جھانسی پہونچا اور سرا میں مقیم ہوا۔

حسب معمول پولیس آٹھ بجے شب کو مسافران سرا کا جائزہ لینے آئی مجھ سے بھی میرا نام و پتہ اور وجہ آمد جھانسی دریافت کی میں نے اسوقت کہدیا کہ میں حسرت کی پیروی مقدمہ اپیل کے لیے آیا ہوں اور بشرط موقع و فرصت انجمن رفاہ المسلمین قصبہ ہردوئی کے لیے چندہ وصول کرنے کی بھی کوشش کروں گا۔

۱۹ ؍ جون ۱۶ء کو بذریعہ درخواست مولانا حسرت سے جیل میں ملاقات کی۔ واپس آیا۔ ۲۰ کو پھر جیل گیا مگر حسرت سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ناکام واپس ہو کر سرا میں کھانا کھا رہا تھا کہ ایک کانسٹبل پولیس نے آکر کہا کہ سب انسپکٹر پولیس آپ کو بلا رہے ہیں۔ ناچار جانا پڑا۔

انھوں نے معمولی نام و پتہ وجہ قیام جھانسی دریافت کرکے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے پاس چلنے کو کہا۔ وہاں بھی گیا۔ اِس دربار کی کچھ گفتگو بطور مکالمہ تحریر کرتا ہوں۔

مسٹر ایچ اے انگلش افسر پولیس۔ آپ کا نام۔(میں) فضل الحسن رضوی

(افسر پولیس) باپ کا نام (میں) مولوی سید محمد حسین رضوی۔

(افسر پولیس) کہاں مکان ہے (میں) ہردوئی ضلع بارہ بنکی۔

(افسر پولیس) کون تھانہ ہے (میں) بھلسر۔

(افسر پولیس) یہاں کیوں آئے۔ (میں) مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی کے مقدمہ کی پیروی کے واسطے۔

(افسر پولیس) حسرت آپ کا کون ہے (میں) میرا بھائی ہے۔

(افسر پولیس) کیسا بھائی ہے (میں) وہ بھی مسلمان ہے میں بھی مسلمان ہوں وہ بھی ہندوستانی ہے میں بھی ہندوستانی ہوں۔ کوئی خاص رشتہ نہیں ہے۔

(افسر پولیس) پھر اُن کی پیروی مقدمہ کے لیئے کیوں آیا ؟ (میں) محض برینائے اخوت و ہمدردی اسلامی۔

(افسر پولیس) غضبناک ہو کر۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ جھانسی کی آب و ہوا مسلمانوں کو ناموافق ہے۔ آپ یہاں کیوں آیا جیل جائیگا تو پھر نہ آئیگا۔ (افسر مذکور) آپ کو معلوم ہے کہ حسرت کس جرم کا مجرم ہے (میں) نہیں میں کیا خود مجرم بھی اپنے جرم سے ناواقف ہے۔

اسپر افسر نے میری نسبت بہت ہی غیر مہذب اور نا ملائم الفاظ استعمال کرکے اور سخت بگڑ کر کہا۔ کہ ول تم کو نہیں معلوم۔

(افسر) آپ چندہ بھی وصول کریں گے حسرت کیواسطے دیں، نہیں حسرت کے لئے نہیں۔ بلکہ انجمن رفاہ المسلمین قصبہ ہردوئی ضلع بارہ بنکی کے لئے۔ وہ بھی بشرط فرصت وموقع۔ وصول چندہ کا ثبوت طلب کرنے پر میں نے انجمن کا ایک مطبوعہ اشتہار دکھادیا جسکے بعد گفتگو ختم ہوگئی۔ اور مجھے صاحب کلکٹر بہادر جھانسی کے پاس جانے کی ہدایت ہوئی۔ وہاں بھی مجھ سے حال دریافت کیا گیا مگر پیرایہ متانت اور تہذیب کے ساتھ اور آخری حکم یہ ملا کہ میں تا حکم ثانی حدود میونسپلٹی سے باہر نہ جاؤں۔ میں نے اسکی پابندی کی مگر پولیس کی نگرانی علانیہ وخفیہ قایم رہی۔ کئی دن کے بعد یہ حکم اٹھا لیا گیا۔ اور اب بظاہر میں آزاد تھا۔ مقدمہ کی تاریخ یکم جولائی سنہ ۱۶ء مقرر تھی۔ تاریخ مذکور پر اخراج اپیل کا حکم سننے کے بعد نقل لے کر وطن واپس آنے کا ارادہ تھا کہ وہی ننھے خان کانسٹبل جو پہلے دن میری عیادت کو آئے تھے پھر میرے پاس آئے۔ اور حکم نادری سنایا کہ اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے کہا ہے کہ آپ فوراً جھانسی سے چلے جایئے ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ میں نے کہا کہ نقل اخراج اپیل لے کر اور میرے پاس خرچ نہیں ہے مکان سے یا علی گڈھ سے خرچ آنے پر جسکے آنے کی امید ہے واپس جاؤں گا۔ اگر ایسا نہیں ہو سکتا اور میرا چلا جانا ناگزیر ہو تو مجھے حکم تحریری لادو اور سرکار ریل کا ٹکٹ بھی خرید کر مجکو دو میں جھانسی ابھی چھوڑتا ہوں۔

بہرحال نقل لینے کے بعد ۵ جولائی سنہ ۱۶ء میں جھانسی سے روانہ ہو کر اپنے وطن ہردوئی صحیح وسالم پہنچا۔ بیگم صاحب حسرت موہانی کا ایک پرائیویٹ خط میرے پاس تھا جسکو کانسٹبل پولیس لے گیا مگر باوجود اسکے کہ اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے مجھسے واپسی کا وعدہ کیا تھا لیکن ابھی تک وہ خط مجکو نہیں ملا ہے۔ اب جائے انصاف ہے کہ افسر پولیس کا ایسے نا ملائم الفاظ استعمال کرنا جائز تھا یا ناجائز*

خادم قوم کمترین سید افضال حسین رضوی ساکن محلہ سالار قصبہ ہردوئی ضلع بارہ بنکی

اس مراسلت کو ایک ایک حرف کو دیکھیے اور پھر حکام اور حکومت کے اس طرز عمل پر غور کیجئے جو وہ حسرت کے معاملہ میں اختیار کئے ہوئے ہیں۔ جب ایک ایسے شخص کے ساتھ جو صرف حسرت کے مقدمہ کی پیروی کرنا چاہتا ہو ایسا معاندانہ سلوک کیا جائے اور صرف اس ایک جرم میں کہ وہ مظلوم حسرت کا ہمدرد ہے ایسی سختی و درشتی کی جائے اور ایسا غیر مہذب طرز عمل اختیار کیا جائے تو اس سے آپ ان سختیوں اور سخت گیریوں کا اندازہ کر سکتے ہیں جو خود غریب حسرت کے ساتھ کی گئی ہونگی۔

اس قسم کی سخت گیریوں کا سلسلہ یہیں پر ختم نہیں ہو گیا بلکہ اور بہت سے لوگوں نے ملنا چاہا مگر بہت کم لوگوں کو اجازت ملی۔ مثلاً ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری اور مسٹر تاج الدین صاحب سپرنٹنڈنٹ سنٹرل بیورو نے ملنے کی اجازت طلب کی تاکہ ان کے مالی معاملات کو درست کرنے کے لئے ان سے مشورہ کریں۔ مگر حکومت نے ان کو ملنے کی اجازت نہیں دی۔ اسیطرح لکھنؤ جیل میں پانچ ہندو مسلمان معززین نے مولانا سے ملنے کی خواہش کی انہیں مرحوم راجہ غلام حسین صاحب بھی تھے۔ مگر لکھنؤ کے ڈپٹی کمشنر صاحب نے ان کو بھی ملنے سے روک دیا اس واقعہ پر معزز انگریزی اخبار لیڈر نے لکھا تھا یہ آیا یہ فعل مسٹر جاپلنگ نے اپنی ذمہ داری سے کیا ہے یا حکام اعلیٰ کی منظوری سے کیا ایک ستم رسیدہ محب وطن سے ان پانچوں آدمیوں کی ملاقات سے گومتی میں آگ لگ جاتی یا جیل خانہ کی ڈسپلن میں ابتری پیدا ہو جاتی۔ کیا گورنمنٹ کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ سیاسی آراء سے قطع نظر کر کے قوم حسرت موہانی کی قدر و منزلت ان کے اعلیٰ کیرکٹر اور بے ریا حب وطن کی وجہ سے کرتی ہے اگر گورنمنٹ ناواقف ہے تو خفیہ پولیس کا محکمہ جسپر ہزاروں روپیہ صرف کئے جاتے ہیں کس قسم کی اطلاعیں اسکو بہم پہونچاتا ہے۔ ایک حکومت کو ان معمولی باتوں سے بلند ہونا چاہیئے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ حکومت کا منشا اور اسکی مصلحت اس روک تھام سے کیا تھی اور کیا ہے

آخری حالات

مولانا میرٹھ میں عرصہ تک اس حالت میں قیام فرما رہے کہ گورنمنٹ کے عائد کردہ قیود سے ان کو کوئی واسطہ نہ رہا صرف اپنی خوشی سے اس بات کا لحاظ رکھا کہ کسی قسم کی شکایت حکومت کو نہ پیدا ہو لیکن خدا معلوم کن وجوہ کی بنا پر حاکم ضلع میرٹھ کی یہ خواہش رہی کہ وہ میرٹھ میں نہ رہیں۔ اور یا تو کھٹورہ میں چلے جائیں یا اپنے وطن مولانا کھٹورہ جانے کے لیئے آمادہ نہ تھے۔ وطن اسی شرط کے ساتھ جانا چاہتے تھے کہ راستہ میں دو ایک روز کے لیئے علیگڈھ میں ٹھہرنے کی اجازت دیجائے مگر اسمیں بہت تشویش ہوئی زبانی آنریبل مرزا سمیع اللہ بیگ نے چیف سکرٹری حکومت صوبہ متحدہ سے وعدہ کر لیا مگر عرصہ تک اسکی باضابطہ تکمیل نہیں ہوئی۔ غرضکہ اسی وجہ سے بہت عرصہ تک مولانا کو میرٹھ میں قیام کرنا پڑا اور بعض اوقات کچھ ایسی صورتیں پیدا ہو گئیں کہ مولانا کو خیال ہوا کہ پھر از سر نو وہی ابتدائی دشواریاں پیدا ہو جائیں گی لیکن بفضلہ یہ نوبت نہیں آنے پائی اور مولانا میرٹھ سے اپنے وطن موہان چلے گئے۔ یہاں دو تین ماہ قیام رہا اس عرصہ میں حکومت کی طرف سے ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ الاؤنس مولانا کی خدمت میں پیش کیا گیا مگر آپ نے اسکو منظور نہیں فرمایا اور اس رقم کے لینے سے انکار کر دیا۔

دسمبر کے دوسرے ہفتہ میں آخر کار وہ قیود بھی مولانا پر سے اٹھائی گئیں جنکے بطور خود لحاظ رکھنے کا مولانا نے وعدہ کیا تھا اور تمام طور سے نقل و حرکت کی اجازت دے دی گئی۔ چنانچہ اب آپ کانگریس لیگ کی شرکت کے لیئے دہلی تشریف لانے والے ہیں۔ جہاں لوگوں کو مولانا کی زیارت کا موقع ملے گا۔

مولانا کی لائف حقیقتاً اسوقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ بیگم صاحبہ حسرت کے

حالات و واقعات شامل نہ کیے جائیں۔ کیونکہ بیگم صاحبہ مولانا کی زندگی کی ہر طرح
سے شریک ہیں اور مولانا کے کاروبار قومی میں ہمیشہ معین و معاون رہی ہیں۔
واقعہ یہ ہے کہ اگر بیگم صاحب کی مستقل مزاجی اور مولانا کے ساتھ ان کی ہمخیالی
شریک حال نہ ہوتی تو مولانا حسرت اس قدر عزم و ثبات کا شاید ثبوت پیش
کرنے سے قاصر رہتے۔

افسوس ہے کہ تفصیل کے ساتھ بیگم صاحبہ کی وہ خدمات نہیں درج
کرسکتے جو وقتاً فوقتاً بیگم صاحبہ نے انجام دیں اور حسرت کی قوت ایمانی
میں اضافہ کیا۔

بہرحال بیگم صاحبہ اس بعد حاضر کی ان خواتین میں سے ہیں جن کے اگر حالات
حیات پردہ راز سے کبھی باہر لائے گئے تو دنیا محو حیرت رہ جائے گی۔

آخر میں خداوند ارض و سما سے دعا ہے کہ وہ اپنی نصرت و تائید سے مولانا
اور انکی بیگم صاحب کو پھر خدمت قومی کی منصب و توفیق عطا فرمائے اور ان کو حوادث
روزگار سے محفوظ و مامون رکھے۔ آمین +

سلسلۂ حالات نظربندانِ اسلام

نمبر (۳)

حضرت مولانا محمود حسن صاحب
قبلہ محدث دیوبندی

کی

مختصر سوانح عمری اور حالات اسیری

قیمت علاوہ محصول ۴ر

تاج الدین سپرنٹنڈنٹ } صدر دفتر انجمن اعانت نظربندانِ اسلام فتحپوری دہلی